ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

❁ حیات و سیرتِ اقبال ❁ فلسفہ اقبال
❁ ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

❁ اقبال اور قرآن ' از قلم: سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے

اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | ذوالقعدہ ۱۴۲۳ھ - جنوری ۲۰۰۳ء | شمارہ ۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

سال گزشتہ یعنی ۲۰۰۲ء کو سرکاری طور پر سالِ اقبال قرار دیا گیا تھا اور ایک تازہ سرکاری اعلامیہ کے مطابق ۲۱/اپریل ۲۰۰۳ء تک سالِ اقبال کا تسلسل جاری رہے گا۔

زندہ قومیں اپنے قومی و ملی مشاہیر اور اپنے اسلاف کی یاد کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتی ہیں اور اُن کی تعلیمات کو اپنے لئے مشعلِ راہ گردانتی ہیں۔ اسی حوالے سے دنیا میں یہ روایت چل نکلی ہے کہ قومی و ملّی مشاہیر کے دن منائے جائیں اور ان کی خدمات کے اعتراف میں کسی ایک سال کو ان کے نام کے ساتھ مختص کر کے ان کے احسانات کا بدلہ چکانے کی کوشش کی جائے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اس طور پر دن اور سال منانا اسلامی تعلیمات اور مزاج سے ہم آہنگی رکھتا ہے یا نہیں، یہ امر واقعہ ہے کہ ملک و ملت کے محسنوں کے احسانات کا اعتراف کرنا، ان کی تعمیری مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کی روشن تعلیمات سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا کہ جو مسلمانوں میں ایک جذبۂ تازہ اور صحیح اسلامی فکر کو اجاگر کرنے کا موجب ہوں، ہمارا دینی و اخلاقی فریضہ ہے۔ افسوس کہ ہم نے غیروں کی نقالی میں دن اور سال منانے کی روایت کو تو اختیار کر لیا اور اس حوالے سے سرکاری طور پر کچھ نمائشی تقریبات کے اہتمام کو اپنا شعار بنانے میں بھی کسی تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا، لیکن جو کام فی الاصل ہمیں کرنا چاہئے تھا اس جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ مشاہیر کے عظمتِ کردار سے اپنے لئے عملی رہنمائی حاصل کرنا اور ان کی روشن تعلیمات سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کرنا سرے سے ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ بقول اقبال۔

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

علامہ اقبال کا شمار ہمارے قومی ہی نہیں عظیم ملّی مشاہیر میں بھی ہوتا ہے۔ وہ اس دور کے عظیم ترجمانِ قرآن تھے۔ انہیں عصرِ حاضر میں قافلۂ ملی کے عظیم ترین حدی خواں کا مقام حاصل تھا۔ محکومی و مایوسی کے اندھیاروں میں غرقِ عالمی ملت اسلامیہ کو اپنی فکر انگیز اور جذبہ پرور شاعری اور امید افزا پیغام کے ذریعے اِک ولولۂ تازہ عطا کرنے کا بے مثال اعزاز انہیں حاصل ہوا۔ انہیں اگر آج حکیم الامت اور مصور و مفکرِ پاکستان کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے تو یہ بلاسبب نہیں ہے۔ ان کا مقام اس سے بھی آگے ایک وژنری کا تھا جس نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کے قیام کی ''بشارت'' دی تھی۔ قیامِ پاکستان کی پشت پر جو بے پناہ ملی جذبہ کارفرما تھا اس کی جوت اقبال نے ہی مسلمانانِ برصغیر کے سینے میں جگائی تھی۔ تعلیماتِ قرآنی پر مبنی اقبال کے فکر انگیز افکار اور ولولہ انگیز پیغام کو حرزِ جاں بنانا اور ان کی روشنی میں پاکستان کی منزل کا تعین کر کے قوم کا قبلہ درست کرتے ہوئے صحیح سمت میں پیش قدمی کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو محض نمائشی طور پر یومِ اقبال یا سالِ اقبال منالینا خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ○○

درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۱)

نحمدهٗ ونصلی علٰی رسوله الكريم ...... امّا بعد:

اعوذ بالله من الشيطٰن الرّجيم ۔ بسم الله الرّحمٰن الرّحيم

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۞ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۞ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۞ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۞ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞﴾ ......صدق الله العظيم

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار لفظ بہ لفظ مطالعہ شروع کریں' حسب معمول چند تمہیدی امور کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مصحف میں اس سورۂ مبارکہ کا مقام کیا ہے۔ ایک جملے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے مکی و مدنی سورتوں پر مشتمل جو سات گروپ ہیں' ان میں سے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں میں اوّلین اور جامع ترین سورۃ سورۃ الحدید ہے۔ لیکن اس

ایک جملے کی کسی قدر وضاحت کی ضرورت ہے۔

سورتوں کی گروپ بندی

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتیں تعداد میں ۱۱۴ ہیں۔ یہ ۱۱۴ سورتیں دو طرح کے گروپس میں تقسیم کی گئی ہیں۔ ایک تقسیم تو وہ ہے جو قدیم ہے' دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے اس تقسیم کا ذکر موجود ہے۔ یہ قرآن مجید کی سورتوں کی سات منزلوں یا سات احزاب میں تقسیم ہے' جبکہ مختلف گروپس میں قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک تقسیم اور ہے جس کی طرف قرآن میں تدبر کرنے والے بعض حضرات کی توجہ ماضی قریب ہی میں منعطف ہوئی ہے' اور وہ یہ ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے بھی قرآن مجید میں سات گروپس ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ قرآن حکیم میں پہلے تمام مکی سورتیں اور پھر تمام مدنی سورتیں آ گئی ہوں' یا اس کے برعکس پہلے تمام مدنی سورتوں کو جمع کر لیا گیا ہو اور پھر تمام مکی سورتوں کو جمع کر لیا گیا ہو۔ اگرچہ بعض اعتبارات سے یہ ترتیب تو نظر آتی ہے کہ طویل سورتیں پہلے ہیں اور چھوٹی سورتیں بعد میں ہیں' لیکن اس میں بھی کوئی معین قاعدہ کلیہ نہیں ہے' بلکہ مختلف مقامات پر فرق و تفاوت نظر آتا ہے۔ تو اب یہ مکی اور مدنی سورتوں کے جو مختلف گروپس بنتے ہیں ان پر جب غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی تعداد میں سات ہی ہیں۔

جہاں تک سات منزلوں یا سات احزاب کا تعلق ہے وہ گویا حجم کے اعتبار سے پورے قرآن حکیم کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے کہ جو شخص ہر ہفتے میں ختم قرآن کر لینا چاہتا ہو' جیسا کہ بہت سے صحابہؓ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اس کا التزام کرتے تھے' تو سہولت رہے کہ ہر روز اگر ایک حزب یا ایک منزل کی تلاوت ہوتی رہے تو ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم ہو جائے۔ اس تقسیم میں چونکہ سورتوں کو پورا پورا شامل کیا گیا ہے اس لئے یہ سات منزلیں حجم میں بالکل مساوی نہیں ہیں۔ پہلی منزل سوا پانچ پاروں کی ہے' باقی ہر منزل کم و بیش چار پاروں پر مشتمل ہے۔ اس تقسیم میں چونکہ سورتوں کی فصیلیں نہیں توڑی گئیں لہٰذا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ البتہ دورِ نبویؐ کی اس تقسیم میں ایک حسن

نظر آتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلی منزل میں تین سورتیں' دوسری منزل میں پانچ' تیسری میں سات' چوتھی میں نو' پانچویں میں گیارہ اور چھٹی منزل میں تیرہ سورتیں ہیں' جبکہ ساتویں منزل ''حزب مفصل'' کہلاتی ہے جو ۶۵ سورتوں پر مشتمل ہے۔

اس تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبویؐ میں سورتوں کو ایک وحدت کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی طرف بڑی توجہ تھی اور سورتوں کا توڑنا پسندیدہ نہیں تھا۔ اس وقت جو ہمیں قرآن مجید تیس پاروں میں منقسم نظر آتا ہے' جنہیں ''سی پارے'' (تیس ٹکڑے) کہا جاتا ہے یہ دورِ صحابہؓ کی شے نہیں ہے' بلکہ بعد کی تقسیم ہے۔ جب مسلمانوں میں تلاوت کا ذوق وشوق کم ہو گیا اور مسلمانوں نے سمجھا کہ اگر ہر مہینے ایک قرآن مجید ختم کر لیا جائے تب بھی بڑی بات ہے تو غالباً کسی مصحف کے صفحات گن کر اسے تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور چونکہ یہ بعد کا کام ہے لہٰذا اس تقسیم میں دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ والا حسن برقرار نہیں رہ سکا اور سورتوں کی فصیلیں ٹوٹ گئی ہیں' بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک سورت کی ایک آیت ایک پارے میں ہے اور بقیہ پوری سورت اگلے پارے میں چلی گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ الحجر (پارہ ۱۳+۱۴) کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ہے۔

سات احزاب کے علاوہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپ بندی اور بھی ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں مکی اور مدنی سورتیں گڈمڈ نظر آتی ہیں' لیکن ان میں بڑی معنویت پنہاں ہے۔ چنانچہ ایک ترتیب میں آنے والی مکی اور مدنی سورتوں کو جمع کر کے اگر گروپ بندی کی جائے تو اس طرح بھی سات گروپ وجود میں آتے ہیں۔ اس طرح سے وجود میں آنے والے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر۔ یہ گروپ بندی معنوی لحاظ سے ہے' چنانچہ اس میں حجم کا لحاظ نہیں ہے۔ کوئی گروپ بہت طویل ہے اور کوئی بہت مختصر۔ لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے اجتماع سے وجود میں آنے والے ہر گروپ کا کوئی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے اس

گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر مکمل کرتی ہیں۔ اس مضمون کا ایک رخ اس گروپ کی مکی سورتوں میں بیان ہوتا ہے تو دوسرا رُخ اسی گروپ کی مدنی سورتوں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ یوں دونوں مل کر اس مضمون کی تکمیل کرتے ہیں۔

پہلے اور آخری گروپ میں ایک عجیب عکسی (reciprocal) نسبت ہے کہ پہلے گروپ میں مکی سورت صرف ایک ہے' یعنی سورۂ فاتحہ جو نہایت مختصر سورۃ ہے اور کل سات آیات پر مشتمل ہے' جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو بہت طویل ہیں اور تقریباً سات پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یعنی سورۃ البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ۔ اس کے بالکل برعکس ہے آخری گروپ جو آخری دو پاروں پر محیط ہے۔ اس کا آغاز سورۃ الملک سے ہوتا ہے اور تقریباً یہ پورے دونوں پارے مکی سورتوں پر ہی مشتمل ہیں' صرف آخر میں چھوٹی چھوٹی چند سورتیں مدنی ہیں۔ یہ تو تھا معاملہ پہلے اور آخری گروپ کا' درمیانی گروپوں میں بھی بڑا توازن نظر آتا ہے۔

دوسرا گروپ اور آخری سے دوسرا یعنی چھٹا گروپ اس پہلو سے نہایت متوازن ہیں کہ ان میں مکی اور مدنی سورتوں کا تناسب تعداد اور حجم کے اعتبار سے تقریباً مساوی ہے۔ (الانعام اور الاعراف مکیات ہیں' جبکہ الانفال اور التوبۃ مدنیات)..... جبکہ چھٹے گروپ میں سات سورتیں مکی ہیں جو تقریباً ایک پارے یا اس سے قدرے زائد پر پھیلی ہوئی ہیں' اور دس سورتیں مدنی ہیں جو حجم کے اعتبار سے تقریباً سوا پارہ بنتی ہیں۔ گویا کہ وہی توازن جو دوسرے گروپ میں تھا یہاں چھٹے گروپ میں بھی موجود ہے۔ اس گروپ کے بارے میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ اس کی مکیات فصاحت و بلاغت' ترکیبِ الفاظ اور صوتی آہنگ (rhythm) کے اعتبار سے قرآن مجید میں منفرد مقام اور نمایاں مرتبے کی حامل ہیں' یعنی سورۃ ق' سورۃ الذاریات' سورۃ الطور' سورۃ النجم' سورۃ القمر' سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ۔ ان میں ایک سورۃ وہ بھی ہے' یعنی سورۃ الرحمٰن' جسے نبی اکرم ﷺ نے ''عروس القرآن'' قرار دیا ہے۔ گویا لفظی اور ادبی اعتبار سے قرآن مجید کا حسین ترین حصہ یہی ہے کہ جو اس گروپ کی مکیات پر مشتمل ہے۔

اس گروپ کی مدنیات بھی دو اعتبار سے نمایاں مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ ایک تو اس پہلو سے کہ مدنی سورتوں کا اتنا بڑا اکٹھ قرآن حکیم میں اور کہیں نہیں ہے' اور دوسرے اس پہلو سے کہ ان سورتوں میں اہم مضامین کے خلاصے آ گئے ہیں جن کی ہمارے نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے اہم موضوعات بالخصوص وہ کہ جو مسلمانوں نے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ متعلق ہیں اور جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں' ان سب کے خلاصے گویا ان دس چھوٹی سورتوں کی شکل میں ہمیں عطا کر دیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دس میں سے چھ سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں' جن میں سے پانچ کا مطالعہ اس سے قبل ہم کر چکے ہیں' یعنی سورۃ الصف' سورۃ الجمعۃ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم' جبکہ چھٹی سورۃ (الحدید) ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

ان دس سورتوں میں سے پانچ کی اضافی امتیازی شان یہ ہے کہ ان کا آغاز تسبیح باری تعالیٰ کے ذکر سے ہوتا ہے' ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ﴾ یا ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ﴾ کے الفاظِ مبارکہ سے۔ چنانچہ ان کے لئے ایک مجموعی نام ''المُسَبِّحات'' تجویز کیا گیا ہے۔ یہ پانچ سورتیں سورۃ الحدید' سورۃ الحشر' سورۃ الصف' سورۃ الجمعۃ اور سورۃ التغابن ہیں' جن میں سوائے سورۃ الحشر کے بقیہ چاروں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔

سورۃ الحدید۔ اُمُّ المُسَبِّحات

اس گروپ کی پہلی سورۃ سورۃ الحدید ہے' جو اس سلسلۂ سُوَر کی طویل ترین سورۃ ہے اور چار رکوعوں میں پھیلی ہوئی ہے' جبکہ بقیہ نو سورتوں میں سے دو سورتیں تین تین رکوعوں کی ہیں اور باقی سات دو دو رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ سورۃ الحدید کو اس پہلو سے اس گروپ کی جامع ترین سورۃ قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ اُن تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بقیہ سورتوں میں الگ الگ زیر بحث آئے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر اسے '' اُمُّ الْمُسَبِّحَاتِ'' کہا جائے تو بات غلط نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمت کے نام قرآن کا جو پیغام ہے' یا دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم جو کچھ اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام سے بحیثیتِ اُمت کہنا چاہتا ہے' اس کا خلاصہ اس ایک سورۂ مبارکہ میں پورے طور پر موجود ہے۔

سورۃ الحدید کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا تجزیہ اصلاً تو سلسلہ وار درس میں آئے گا' تاہم آغاز میں اس کے مضامین کا ایک اجمالی تجزیہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

اس کا پہلا حصہ چھ آیات پر مشتمل ہے۔ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے بیان پر یہ چھ آیتیں میرے علم کی حد تک قرآن حکیم کا جامع ترین مقام ہے۔ اور یہی اصل علم ہے جس کو ''العلم'' کہا جائے گا' اس لئے کہ دین کی جڑ بنیاد ایمان ہے اور ہم حقیقت ایمان پر بڑی مفصل بحثیں کر چکے ہیں۔ اگرچہ ایمانیات میں تعدد ہے' اللہ پر ایمان' آخرت پر ایمان' رسالت پر ایمان' کتابوں پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' لیکن اصل ایمان ''ایمان باللہ'' ہے۔ اسی لئے ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ ہی کا ذکر ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ".

چنانچہ مجملاً ایمان نام ہے ایمان باللہ کا۔ اور ایمان باللہ کا خلاصہ کیا ہے؟ اللہ کی معرفت! اور اُس کی معرفت ذات وصفات کے حوالے سے ہوگی۔ جامعیت کے اعتبار سے اور فہم وشعور کی اعلیٰ ترین سطح (Highest level of consciousness) پر ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان ان چھ آیات میں ہے جو سورۃ الحدید کے شروع میں واقع ہوئی ہیں۔ اس کی کچھ جھلک ہمیں سورۃ التغابن میں ملتی ہے' کچھ جھلک مکی سورتوں میں اور پھر سورۃ الشوریٰ میں ملتی ہے' لیکن اس ضمن میں جامع ترین اور بلند ترین بحث ان چھ آیتوں میں ہے۔

سورۃ الحدید کا دوسرا حصہ پانچ آیات (۷ تا ۱۱) پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی جامعیت کی انتہا ہے کہ دین کے کل تقاضے صرف دو الفاظ ''ایمان'' اور ''انفاق'' کے حوالے سے آ گئے:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

یعنی اگر تم یہ دونوں تقاضے پورے کرتے ہو تو تمہارے لئے اجر کبیر ہے۔ اور اگر نہیں کرتے ہو تو پھر ملامت ہے' زجر ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے کہ ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے! کیوں تمہارا اعتماد اور توکل اللہ کی ذات پر قائم نہیں ہے؟ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے! اپنا مال اللہ کے راستے میں کیوں نہیں کھپاتے' کیوں نہیں لگاتے؟

تیسرا حصہ چار آیات (۱۲ تا ۱۵) پر مشتمل ہے جس میں اس تقسیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو میدانِ حشر میں ہو جائے گی۔ جن لوگوں نے بھی اس معاملے (ایمان اور انفاق) میں گریز کی راہ اختیار کی تھی وہ منافق قرار پائیں گے اور اہل ایمان سے اس طرح الگ کر دیئے جائیں گے جیسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ میدان حشر میں ایک خاص مرحلہ ایسا ہے کہ جس میں مؤمنین صادقین اور منافقین میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک تقسیم تو مسلمان اور کافر کی ہے' جبکہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں پھر تفریق ہو گی کہ کون مؤمنین صادقین ہیں اور کون منافقین! مؤمنین صادقین کو ان کے قلبی ایمان کی گہرائی کی نسبت سے نور عطا کیا جائے گا' جو کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملے گا۔ حضور ﷺ نے خبر دی ہے کہ اس نور میں اتنا فرق و تفاوت ہو گا کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ جیسے اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچ جائے اور کسی کو اتنا نور ملے گا کہ جس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے۔ اس کی سادہ سی مثال ٹارچ کی ہے۔ اگر اندھیری رات میں آپ کسی پگڈنڈی پر چل رہے ہوں اور آپ کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ ہو تو وہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس روز جو نور انبیاءِ کرام علیہم السلام کو ملے گا یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا ہو گا اُس کا تو کیا ہی کہنا ہے! ظاہر ہے کہ اس نور میں اور ایک عام مسلمان کے نور میں بہت فرق و تفاوت ہو گا۔

بہر حال جن کے دلوں میں کچھ بھی ایمان ہوگا وہ ایک طرف اور جو ایمان سے بالکل خالی ہوں گے یعنی منافق وہ دوسری طرف ہو جائیں گے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ پھر اسی ضمن میں نفاق کی حقیقت اور نفاق کے مختلف مراحل بھی اسی حصے میں بیان ہوئے ہیں کہ کیسے یہ مرض آگے بڑھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ جامع ترین مقام ہے۔

سورۂ مبارکہ کا چوتھا حصہ بھی چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ اس میں اصلاح کی ترغیب دی گئی ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ ایمان حقیقی نصب نہیں ہے تو بھی گھبراؤ نہیں' ابھی مہلت ہے' کمر ہمت کسو اور اصلاحِ احوال کی کوشش کرو' ایمان کے حصول کی کوشش کرو۔ اس کے لئے راستہ اور طریقہ بھی بتا دیا گیا۔ یوں سمجھئے کہ ان چند آیات میں ''سلوکِ قرآنی'' جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

پھر پانچواں حصہ پانچ آیات (۲۰ تا ۲۴) پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل آیا ہے اور انسانی زندگی کے مختلف مراحل یعنی بچپن' اس کے بعد نوجوانی اور پھر جوانی کا دور' پھر ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا' ان کو بڑی خوبصورت تمثیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کو بہر حال ان مراحل سے گزر کر لامحالہ قبر میں جا اترنا ہے۔ یہ زندگی ان مراحل سے گزر کر بہر حال ختم ہو جائے گی اور ایک ابدی زندگی آخرت کی ہے' جس میں انسان کو دو انجاموں میں سے کسی ایک انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اس اعتبار سے حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل آ گیا۔ اور پھر یہ کہ حیاتِ دُنیوی میں انسان کو جو کچھ مصائب اور ناگوار حالات سے سابقہ پیش آتا ہے' اس کی اصل حقیقت کھول کر دکھائی گئی۔

اس سورۂ مبارکہ کا چھٹا حصہ صرف ایک آیت پر مشتمل ہے اور وہ ہے آیت نمبر ۲۵' جس کے بارے میں میرا یہ قول بہت سے احباب کے علم میں پہلے سے ہوگا کہ پوری دنیا کے تمام تر انقلابی لٹریچر میں اتنا عریاں انقلابی جملہ آپ کو نہیں مل سکتا جو سورۃ

الحدید کی اس آیت میں ہے۔ یہاں اس انقلاب عظیم اور اس کے تمام مراحل کا ذکر ہے جو قرآن برپا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے انبیاء کو بھیجا' کتابیں نازل کیں' شریعت اتاری اور پھر یہ میزان نازل فرمائی' آخر کس لئے؟ اس لئے تاکہ عدل اور انصاف قائم ہو۔ اب عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لئے انقلاب لانا پڑے گا۔ اس کے لئے جہاں ترغیب ہے' تشویق ہے' دعوت ہے' تعلیم ہے' وہاں لوہے کی طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا''۔ اسی آیت کے حوالے سے اس سورت کا نام سورۃ الحدید ہے۔ طاقت کے بغیر کبھی بھی نظام نہیں بدلا کرتا۔ اس کے بغیر عدل و انصاف قائم نہیں ہوسکتا۔ طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے' جانیں دینی پڑتی ہیں۔ اور درحقیقت اللہ تعالیٰ اپنے ان جان نثار بندوں کا امتحان لے رہا ہے جو ایمان کے دعوے دار ہیں کہ آیا وہ اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اور لوہے کی قوت ہاتھ میں لے کر میدان میں آتے ہیں یا نہیں! کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بات بالکل واضح کر دی گئی کہ انقلابی عمل میں لوہے کی طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی' اس کے بغیر vested interest کبھی بھی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دلیل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے سلیم الفطرت لوگ ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ہوتے ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی ہر نظام میں مستکبرین اور مترفین پر مشتمل جو مراعات یافتہ طبقہ ہوتا ہے وہ درحقیقت اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا' اس کے لئے طاقت کا استعمال لازمی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا ساتواں اور آخری حصہ چار آیات (۲۶ تا ۲۹) پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں جہاد و قتال اور انقلاب کے اینٹی کلائمکس یعنی رہبانیت کا ذکر ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو' اللہ ہُو' اللہ ہو!

اس رہبانیت کی نفی بھی کر دی گئی ہے کہ اگرچہ کچھ نیک دل لوگ ادھر راغب ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے وفادار بندے چلیں' وہ

رہبانیت کا راستہ نہیں ہے۔

سورۃ الحدید سے میری ذہنی و قلبی مناسبت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں اپنا ایک تاثر تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ بالکل آغاز میں جبکہ ابھی میں اپنے اس مشن کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا' اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے حوالے سے خصوصی انشراح عطا فرمایا تھا اور اس سے مجھے ایک خصوصی ذہنی و قلبی نسبت اور مناسبت عطا فرما دی تھی۔ یہ میں ۵۷۔۱۹۵۶ء کی بات کر رہا ہوں۔ اُس وقت سے میں مختلف مواقع پر اس کے دروس دیتا رہا ہوں۔

۱۹۵۸ء کا ذکر ہے کہ میں نے کراچی کی ایک محفل میں سورۃ الحدید کا درس دیا۔ اس محفل میں میرے اعزہ میں سے ایک صاحب موجود تھے جو مجھ سے عمر میں بڑے ہیں' ان کی جماعت اسلامی کی رکنیت قبل از تقسیم ہند سے ہے۔ اس سے پہلے وہ علماءِ دیوبند میں سے خاص طور پر تھانوی حلقے سے وابستہ تھے۔ گویا کہ مذہبی اور دینی مزاج شروع سے ہے۔ انہوں نے جب میرا درس سنا تو اُس وقت کہا تھا کہ آپ کو اللہ نے قرآن مجید کے ساتھ جو مناسبت عطا کی ہے اس کے پیش نظر آپ میڈیکل پریکٹس اور دوسرے سارے دھندے چھوڑیں اور اب صرف دین کے پڑھنے اور پڑھانے میں لگ جائیں' آپ کے سارے اخراجات میرے ذمہ رہیں گے۔ بہرحال میں نے تو اس بات کو اُس وقت ہنس کر ٹال دیا تھا' لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اصل میں انسان کو قرآن مجید کی جو نعمت بھی ملتی ہے وہ محض پڑھنے پڑھانے سے نہیں ملتی' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قرآن حکیم کی جو تھوڑی بہت سمجھ دے دی ہو اس پر وہ عمل کر رہا ہو تو پھر اس پر مزید دروازے کھلتے ہیں اور فہم قرآن کے کچھ اور پہلو منکشف ہوتے ہیں۔ پھر آدمی جب اپنے عمل میں اضافہ کرتا ہے تو پھر اور چیزیں سامنے آتی ہیں۔ اس طرح یہ درجہ بدرجہ انکشاف ہوتا ہے۔

مولانا مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدمہ میں بڑا پیارا جملہ لکھا ہے کہ قرآن مجید ایسی کتاب نہیں ہے جسے کوئی شخص اپنی لائبریری میں آرام کرسی پر بیٹھ کر لغت کی

کتابوں اور ریفرنس بکس کی مدد سے سمجھ لے۔ قرآن اپنے آپ کو اس طور سے reveal کرتا ہی نہیں۔ وہ تو آپ کو جس جدوجہد میں لگانا چاہتا ہے اس میں آپ بالفعل لگ جایئے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کا مطالعہ بھی کرتے رہئے اور اس کا درس بھی دیتے رہئے' تو واقعہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ پھر یہ گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور نئے نئے مضامین کا انکشاف ہوتا ہے۔ گویا ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے!

میرے بہت سے احباب نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ آپ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں۔ میں نے ان سے صاف صاف کہا ہے کہ میرا یہ مقام ہی نہیں ہے۔ آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ مقام نہیں ہے۔ البتہ سورۃ الحدید کے بارے میں میرے دل میں ایک آرزو پوشیدہ ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ موقع دے دے تو میں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اور جو بھی اس کے مختلف رموز مجھ پر منکشف ہوئے ہیں انہیں قلم بند کر دوں۔ آپ بھی دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

تمہیدی امور میں سے آخری بات یہ کہ مجھے اس سورۂ مبارکہ کے درس کے آغاز کے موقع پر ایک خوف بھی محسوس ہو رہا ہے' اور یہ خوف دو اعتبارات سے ہے' ایک تو طوالت کا خوف ہے کہ ہوسکتا ہے بات بڑھتی چلی جائے۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ بات ایک حد تک رہے اور میری کوشش یہی ہوگی کہ بارہ نشستوں میں اس سورۂ مبارکہ کی تکمیل ہو جائے' لیکن میں اس کا یقین نہیں رکھتا' اللہ تعالیٰ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ مزید برآں مجھ پر اس کی عظمت کا رعب بھی ہے' خاص طور پر اس کے پہلے حصے کو بیان کرنا واقعتاً آسان کام نہیں ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انشراح عطا فرمائیں۔ اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار درس شروع کر رہے ہیں۔

پہلی آیت۔ تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم

سورۃ الحدید کا آغاز اِن پرشکوہ الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ''تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ اس کا پہلا لفظ ''سَبَّحَ'' ہے۔ اس لفظ پر گفتگو اگرچہ سورۃ الصّف' سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن کے ضمن میں ہو چکی ہے' لیکن بہرحال اب جبکہ ہم اس کا مطالعہ کر رہے ہیں تو میں تیزی کے ساتھ چند باتیں دہرا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا ترجمہ ہم کرتے ہیں ''اللہ کی تسبیح کرتی ہے' پاکی بیان کرتی ہے ہر شے جو آسمان اور زمین میں ہے''۔ لیکن لغوی طور پر لفظ ''سَبَّحَ'' کا مفہوم کیا ہے! سَبَّحَ یُسَبِّحُ عربی زبان میں آتا ہے کسی شے کے تیرنے کے لئے۔ تیرنا پانی میں بھی ہو سکتا ہے' ہوا میں بھی اور خلا میں بھی۔ یعنی کوئی شے اپنی سطح پر برقرار رہے' نیچے نہ گرے۔ اگر پانی کی سطح پر ہے تو گویا کہ وہ تیر رہی ہے' اگر نیچے جائے گی تو ڈوب جائے گی۔ اسی طرح کوئی شے اگر خلا میں یا فضا میں حرکت کر رہی ہے' لیکن اپنے مدار پر برقرار ہے' اپنی سطح پر قائم ہے تو یہ ہے سَبَّحَ یُسَبِّحُ یعنی تیرنا۔ یہ فعل لازم ہے۔ اس سے باب تفعیل میں ''سَبَّحَ یُسَبِّحُ'' آتا ہے' یعنی کسی شے کو تیرانا۔ یہاں پر اب یہ فعل متعدی بن گیا۔ کسی شے کو اس کی اصل جگہ پر' اس کی سطح پر برقرار رکھنا' اسے نیچے نہ گرانا یا نیچے نہ گرنے دینا۔ یہ اس لفظ کا لغوی مفہوم ہے۔

اللہ کی تسبیح کے کیا معنی ہیں؟ اللہ کا جو مقامِ بلند ہے' اسے اس پر برقرار رکھا جائے۔ کوئی ایسا تصور اس کی ذات یا صفات کے ساتھ شامل نہ ہو جائے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو اور اس کے مقام سے فروتر ہو۔ اللہ کو اس کے اصل مقام رفیع پر برقرار رکھنا اللہ کی تسبیح ہے۔ اس کو اب ہم اس طور سے بیان کرتے ہیں کہ تسبیح سے مراد یہ کہنا ہے کہ اللہ پاک ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے' ہر عیب سے مبرا ہے' منزہ ہے' نہ اس میں کسی اعتبار سے کوئی عیب ہے نہ کسی لحاظ سے کوئی نقص ہے۔ نقص اور عیب میں یہ فرق ہے کہ عیب وہ شے ہے جو کہ ناپسندیدہ ہے اور نقص صرف کمی کا نام ہے۔ نہ کسی اعتبار سے اسے کوئی احتیاج لاحق ہے' جس کو ہم اپنی زبان میں کہیں گے کہ اس کی کئی کسی سے دبتی نہیں ہے' وہ مستغنی ہے' اس کو کسی کی کوئی احتیاج نہیں۔ تو اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے' ہر عیب سے' ہر نقص سے' ہر کوتاہی سے اعلیٰ' ارفع' منزہ اور مبرا

ہے' یہ تسبیح ہے۔

تسبیح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تسبیح قولی ہے۔ جو ہم کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ' سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ' سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی' یہ تسبیح قولی ہے۔ یعنی زبان سے اللہ کی پاکی کا اور اللہ کے ہر اعتبار سے ایک ہستی کامل ہونے کا اقرار کرنا۔ جبکہ ایک تسبیح حالی ہے کہ کائنات کی ہر شے گویا اپنے وجود سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے کہ میرا خالق' میرا صانع' میرا ڈیزائنر' میرا Creator ایک ہستی کامل ہے کہ جس کے علم میں' قدرت میں' حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ اس لئے کہ تصویر حقیقت میں اپنے مصور کے کمال فن یا نقصِ فن کا مُنہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔ اگر اس کے فن میں کوئی کمی ہے تو اس کی غمازی بھی تصویر کر دے گی۔ اور اگر اس کا فن کمال پر ہے' نقطۂ عروج پر ہے تو بھی اس کی تصویر زبانِ حال سے بول رہی ہوگی۔ تو یہ کل کائنات اس معنی میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔

تسبیح حالی کا یہ مفہوم تو بالکل سمجھ میں آ جاتا ہے' لیکن قرآن مجید کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان بھی دے رکھی ہے جس سے وہ اُس کی تسبیح کر رہی ہے۔ یہ بات اگرچہ ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ایک تو قرآن مجید میں صراحت سے مذکور ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام حمد کے ترانے الاپتے تھے تو اس میں پہاڑ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے اور پرندے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ یہ قرآن مجید کی نصِ قطعی ہے۔ مزید برآں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں ارشاد ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ﴾ ''اللہ کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان آسمانوں اور زمین میں ہے' سب کر رہے ہیں''۔ اب یہ تو مثبت پہلو ہوا' منفی طور پر پھر فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ﴾ ''نہیں ہے کوئی شے مگر وہ تسبیح کر رہی ہے اس کی تحمید کے ساتھ' لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے''۔ تو تسبیح حالی تو ہماری سمجھ میں آ رہی ہے' معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر شے تسبیح قولی میں بھی مشغول ہے۔

قرآن مجید کے ایک اور مقام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قیامت کے

دن لوگوں کے اعضاء کو بھی زبان دے دے گا' اور ان کے ہاتھ' ان کے کان' ان کی آنکھیں' ان کے اپنے اعضاء و جوارح اور ان کی اپنی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔ اور جب وہ کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا﴾ ''(ہمارے اپنے اعضاء ہو کر) تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟'' تو یہ اعضاء و جوارح جو جواب دیں گے قرآن مجید میں وہ قول نقل ہوا ہے: ﴿قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (حم السجدۃ:۲۱) ''وہ کہیں گے کہ آج ہمیں بھی نطق اور گویائی عطا فرمادی ہے اللہ نے جس نے ہر شے کو نطق اور گویائی عطا فرمائی ہے''۔

یہ مختلف مقامات ہیں جن کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اللہ نے کوئی زبان بھی دی ہوئی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ حیوانات کی اپنی زبان ہے' آخر وہ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ آخر ایسے جانور بھی ہیں جو کالونیاں بنا کر مل جل کر رہتے ہیں' ان کا پورا نظام ہے' ان کا پورا کا پورا سوک (civic) سسٹم ہے' چاہے چیونٹیاں ہوں یا شہد کی مکھیاں ہوں' تو کیسے ممکن ہے کہ ان کی باہم گفتگو نہ ہوتی ہوگی! تو اس اعتبار سے یہ تسبیح' تسبیح حالی بھی ہے اور تسبیح قولی بھی۔

یہاں ''سَبَّحَ'' صیغہ ماضی ہے۔ اس کے بعد دو اور سورتوں یعنی سورۃ الحشر اور سورۃ الصف میں یہ لفظ اسی طرح آیا ہے' لیکن پھر سلسلۂ مسبحات کی آخری دو سورتوں (الجمعہ اور التغابن) میں یہ لفظ مضارع کے صیغے ''یُسَبِّحُ'' میں ڈھل گیا۔ ''یُسَبِّحُ'' کا لفظ ایک بار سورۃ الحشر کے اختتام پر بھی آیا ہے۔ اس طرح ان سورتوں میں تسبیح کا ذکر تین مرتبہ فعل ماضی میں ہوا اور تین ہی مرتبہ فعل مضارع میں۔

قرآن مجید ''مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' یعنی ''آسمانوں اور زمین میں'' کے الفاظ کل کائنات کی تعبیر کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ہم فلسفیانہ زبان میں اس کے لئے کون و مکاں' کل کائنات' The Total Universe جیسے مختلف الفاظ استعمال کریں گے' لیکن قرآن مجید نے اپنا اسلوب بہت سادہ رکھا ہے' کیونکہ اس کے مخاطب اوّل ایک ایسی قوم کے افراد تھے کہ جن کے ہاں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا' فلسفہ

اور منطق تو ان کے لئے بہت ہی بعید شے تھی۔ اس حوالے سے قرآن نے وہ انداز اختیار کیا جو فطرت کے بالکل قریب ترین اور سادہ ترین انداز ہے۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں کہیں کائنات کا لفظ نہیں ملے گا' جب بھی قرآن کل کون و مکاں کہنا چاہتا ہے' "مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" کے الفاظ استعمال کرتا ہے تاکہ ایک عام بدو بھی اس کو سمجھ لے' لیکن اس سے مراد کل کائنات ہے' جس کے لئے ہم اگر زیادہ فلسفیانہ لفظ استعمال کریں تو ''کون و مکاں'' ہے' یعنی یہ جو بھی ٹائم اینڈ سپیس کمپلیکس (Time&Space Complex) موجود ہے اس میں ہر شے اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔

اختیارِ مطلق اور حکمت کاملہ

آیت کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞﴾ ''اور وہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں اسماء ان سورتوں میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۃ الصف کے شروع میں بھی آئے' سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت کا اختتام بھی ان دونوں اسماء کے ساتھ ہوا۔ سورۃ الحشر تو اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی تسبیح ہے' آخر میں بھی تسبیح ہے۔ پہلی آیت کے الفاظ ہیں: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞﴾ اور آخری آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہو رہا ہے: ﴿يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞﴾ یعنی پہلی اور آخری دونوں آیتوں کے آخری الفاظ ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' ہیں۔ اسی طرح سورۃ التغابن کا اختتام بھی انہی الفاظ پر ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اَسماء و صفات جو قرآن مجید کی آیات کے فواصل کے طور پر آتے ہیں' یعنی جن پر آیات کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں' جیسے وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ تو یہ مختلف جوڑے آپ کو ملیں گے۔ یہ اگر الف لام کے ساتھ ہوں تو اسماء شمار ہوں گے اور بغیر الف لام کے' تنوین کے ساتھ ہوں' جیسے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تو صفات شمار ہوں گے۔ تو

یہاں فرمایا: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہ زبردست ہے' حکیم ہے''۔

ان دونوں اسماء کی باہم مناسبت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کو جوڑا گیا ہے تو کسی مناسبت کی وجہ سے جوڑا گیا ہے۔ ان دونوں اسماء میں بہت گہرا ربط ہے۔ ''عزیز'' کہتے ہیں ایسی ہستی کو جس کا اختیار مطلق ہو' جس کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو' آخری اختیار اُس کے پاس ہو۔ لفظ ''حکیم'' کے دو مفہوم ہیں۔ ''ح ک م'' مادہ سے لفظ حکمت بھی بنا ہے اور اسی سے حکومت اور حاکم بھی بنا ہے' تو لفظ حکیم بہت سے معنی اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن یہاں پر عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے حکمت والا' دانا۔ ہمارے عام مشاہدے اور انسان کے عمومی تصور سے یہ بات سامنے آتی ہے' خاص طور پر پولیٹیکل سائنس میں یہ بحث بڑی تفصیل کے ساتھ آتی ہے کہ جہاں بھی اختیار ہوگا اس کے ناجائز استعمال کا احتمال ہوگا۔

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

یہی وجہ ہے کہ دستور سازی میں سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں کوئی اتھارٹی ہو وہاں احتساب کا کوئی نظام بھی ہونا چاہئے' ورنہ یہ کہ اگر صاحب اختیار بدعنوان ہو جائے' جہاں کسی کی ذات میں زیادہ اختیارات مرکوز ہو جائیں اور اس کے دماغ کے اندر خناس پیدا ہو جائے تو وہ لامحالہ ان اختیارات کا ناجائز استعمال کرے گا۔ لہٰذا Checks & Balances ہونے چاہئیں۔ چنانچہ مملکتوں کے جو دستور بنتے ہیں ان میں سب سے نازک مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ اختیارات میں ایک توازن ہو' بیلنس ہو' اور جہاں اختیار ہو وہیں پر کوئی احتساب کا نظام بھی موجود ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے اس تصور سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اس کا اختیارِ مطلق حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ البتہ جہاں وہ اختیارِ مطلق کا مالک ہے وہیں الحکیم بھی ہے' اس کی حکمت بھی کامل ہے۔ اس کا اختیارِ مطلق الل ٹپ استعمال نہیں ہوتا' حکمت کاملہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں تو میں اس مفہوم کو ادا کرنے میں ذرا غیر محتاط الفاظ استعمال کر جاتا تھا کہ ''اس کا اقتدار اس کی حکمت کے تابع

ہے''۔ یا یہ کہ ''اس کا اختیار مطلق حکمت کاملہ کے تحت استعمال ہوتا ہے''۔ لیکن یہ الفاظ ہمیں استعمال نہیں کرنے چاہئیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اپنی جگہ پر مطلق ہیں' کوئی صفت کسی دوسری صفت کے تابع نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو تابع ہوئی وہ پھر مطلق نہ رہی بلکہ محدود ہو گئی۔ اس لئے یہاں تعبیر کا بہتر انداز یہ ہوگا کہ جہاں اس کے اندر اختیارات کا ارتکاز ہے اس کے ساتھ ہی حکمت کاملہ بھی موجود ہے۔ تو اس کا اختیار حکمت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے' یہ ہے درحقیقت ان دونوں اسماء میں باہمی ربط۔

اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی ذمہ داری

ان سورتوں (مسبحات) میں خطاب اُمت مسلمہ سے ہے اور اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا سیاسی نظام یعنی نظامِ حکومت قائم کریں جس میں اللہ تعالیٰ کا دین بتمام وکمال قائم ہو جائے۔ اسی حوالے سے ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے ان دو اسماء (اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ) کو بار بار لایا گیا ہے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ان چھ آیات میں دو مرتبہ یہ الفاظ آ رہے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے''۔ یہ الفاظ دوسری آیت میں بھی آئے ہیں اور پھر چھٹی آیت میں بھی۔ درحقیقت اللہ کی بادشاہت کا یہ تصور ہمارے دورِ زوال میں مسلمانوں کے ذہنوں سے نکل گیا۔ عقائد اور عبادات کی اہمیت تو پیش نظر رہی لیکن اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا تصور خلافت راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ ذہنوں سے محو ہوتا گیا۔ اس لئے کہ جب خلافت ختم ہوئی تو ملوکیت کا آغاز ہو گیا۔ اُس وقت اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لئے کچھ کوششیں ہوئیں' حضرت حسینؓ نے کوشش کی' حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے کوشش کی' پھر اس کے بعد حضرت زیدؒ نے کوشش کی' پھر حضرت نفس زکیہؒ نے کوشش کی' لیکن یہ سب کوششیں دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو گئیں' اگرچہ یہ سب لوگ اپنی جگہ پر اُخروی اعتبار سے کامیاب ہیں۔ جب یہ تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو مسلمانوں نے ذہناً تسلیم کر لیا کہ اب یہ حکومت اور ریاست کا معاملہ تو عصبیت کے بل پر چلے گا۔ کوئی قبائلی عصبیت مضبوط ہے تو وہ قبیلہ آ کر حکومت کر لے گا۔ کوئی شہنشاہ بابر

آئے گا اور ہندوستان کے تخت پر متمکن ہو جائے گا اور اس طرح مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑ جائے گی۔ یہ چیزیں تو قبائلی عصبیت اور قوت کی بنیاد پر تسلیم کر لی گئیں' تو اس کے نیچے نیچے اب دین کیا رہ گیا؟ اب دین میں عقائد ہیں' عبادات ہیں اور کچھ نکاح وطلاق کے مسائل ہیں' اللہ اللہ اور خیر صلا۔

دورِ خلافت راشدہ کے بعد نظام حکومت میں جو تبدیلی آ چکی تھی اس کا اندازہ ذرا صحیح بخاری کی اس حدیث سے کیجئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں: ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کئے۔ ان میں سے ایک برتن سے تو میں نے خوب تقسیم کیا' لیکن اگر دوسرے برتن کا منہ کھول دوں تو میری گردن اڑا دی جائے گی''۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا تو ۵۹ھ میں انتقال بھی ہو گیا تھا جبکہ ابھی حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت تھی' ابھی وہ اگلا دورِ ملوکیت تو آیا بھی نہیں تھا۔ حضرت معاویہؓ کے دورِ حکومت کو اگرچہ ہم دورِ خلافت راشدہ میں شامل نہیں سمجھتے' لیکن آپؓ بہرحال صحابیٔ رسولؐ ہیں' کاتب وحی ہیں' اپنی ذات کے اعتبار سے ایک صحابی کی حیثیت سے جو اُن کا منصب ہے اس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ اس کے باوجود اُن کے دورِ حکومت میں نظام کی تبدیلی اس درجے آ چکی تھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں دوسرے برتن کا منہ بھی کھول دوں گا تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔

اس کے بعد تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رفتہ رفتہ اللہ کی حکومت کا تصور ہی مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا اور دین کا تصور باقی یہ رہ گیا کہ اللہ کو ایک مانو' اللہ کے لئے نماز پڑھو' اللہ کے لئے روزے رکھو' اللہ کے لئے حج کرو۔ یہ ساری چیزیں تو برقرار رہیں لیکن اللہ کی حکومت کو قائم کرنا ہمارے ذہنوں سے نکل گیا۔ لیکن ان سورتوں میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اسماء ''اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' بار بار لائے جا رہے ہیں۔ اور ''اَلْحَکِیْمُ'' کا دوسرا مفہوم ذہن میں رکھئے تو اس کے معنی حاکم کے ہو جائیں گے۔ گویا العزیز بھی حاکم' الحکیم بھی حاکم۔ حاکم اور حکیم میں وہی نسبت ہو گی جو عالم اور علیم

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

اقبال اور دورِ ابلیسیت

حافظ عاکف سعید

آج کے سیمینار کا موضوع نہایت اچھوتا ہے' یعنی ''اقبال اور دور ابلیسیت''۔ اس حوالے سے یہ بات اصولی طور پر نوٹ کر لیجئے کہ تخلیق آدم سے لے کر آج تک کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں ابلیس نے اپنی شکست تسلیم کی ہو اور وہ اپنے اس چیلنج سے دست کش ہو گیا ہو جو اس نے اللہ کو دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس نے اپنی ہار اور شکست تسلیم نہیں کی۔ وہ مسلسل سرگرم عمل ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶ میں ابلیس کے اس چیلنج کا ذکر ہے کہ ﴿..... لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۞﴾ ''(پروردگار!) میں تیری صراطِ مستقیم پر لازماً گھات لگا کر بیٹھوں گا (اور تیرے بندوں کو تیرے راستے سے برگشتہ کروں گا)۔'' پھر اس کے لئے اس نے مہلت بھی مانگی کہ ﴿اَنْظِرْنِيْ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۞﴾ ''قیامت تک کے لئے مجھے مہلت عطا فرما۔'' سورۂ ص میں ابلیس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞﴾ ''(پروردگار!) تیرے جلال کی قسم ہے میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔'' چنانچہ ابلیس کی فتوحات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا' ہاں وقتی طور پر نوع انسانی کا ایک جزوی حصہ تقریباً ہر دور میں اسے شکست دینے میں کامیاب رہا ہے' لیکن اس کی عمل داری تخلیق آدم سے لے کر آج تک کسی نہ کسی شکل میں چلی آ رہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ تاہم یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج فیصلہ کن طور پر ابلیس کا غلبہ ہے اور وہ محض دنیاداروں پر نہیں بلکہ اہل مذہب اور اہل اللہ سب پر غالب ہے' الا ماشاء اللہ۔ اسی کا دوسرا نام دجالی دور ہے۔

دورِ ابلیسیت کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ ابلیسیت سے کیا مراد ہے! ابلیس کا اصل چیلنج چونکہ یہ تھا کہ میں نوع انسانی کو صراط مستقیم سے برگشتہ کروں گا' لہٰذا اس حوالے سے ابلیسیت کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہے جو بھی چیز صراطِ مستقیم یعنی آسمانی

ہدایت سے ہٹی ہوئی ہو وہ ابلیسیت کا مظہر ہے۔ خواہ اس کا تعلق فکر سے ہو یا عمل سے' نظریئے سے ہو یا عقیدے سے' انفرادی معاملات سے ہو یا اجتماعی معاملات سے' ہدایتِ ربانی سے گریز کی ہر صورت ابلیسیت ہی کی مظہر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی معین کردہ صراط مستقیم سے متصادم کوئی بھی چیز خواہ وہ عقل و دانش کے مرعوب کن عنوان کے تحت ہو یا فلسفے اور نظریات کی صورت میں' وطن پرستی کے خوشنما عنوان سے ہو یا جمہوری آزادی کے دلفریب نعرے کی بنیاد پر' سیکولرازم کے خوش کن عنوان کے تحت ہو یا اباحیت پرستی کے پُرکشش نعرے کی صورت میں' یہ سب ابلیسیت ہی کی شکلیں ہیں۔

کلامِ اقبال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے ابلیس کو غیر معمولی اہمیت دی ہے' اور اس کا سبب بھی بآسانی سمجھ میں آتا ہے۔ اقبال دورِ حاضر کے عظیم ترین ترجمان القرآن ہیں' اور قرآن مجید میں ابلیس کو غیر معمولی اہمیت دی گئی' قصہ آدم و ابلیس قرآن حکیم میں سات مرتبہ دہرایا گیا ہے' اسی کا عکس اقبال کے کلام میں نظر آتا ہے۔ سورۂ فاطر کی آیت ۶ میں سختی کے ساتھ تاکید ہے ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ﴾ ''اے انسانو! یہ شیطان تمہارا دشمن ہے''۔ یہاں جھنجوڑا جا رہا ہے کہ یہ جو قرآن میں ابلیس کا ذکر بتکرار ہو رہا ہے اور بار بار اس کی دشمنی کا حوالہ آیا ہے' تو جان لو کہ یہ کوئی خیالی و وہمی یا تخیلاتی و تصوراتی قسم کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ﴿فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ''تو اسے اپنا دشمن ہی سمجھو''۔ اسے اپنے رقیب کا درجہ دو اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ اسی طرح فرمایا گیا ﴿وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝﴾ ''دیکھو کہیں یہ سب سے بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے اور فریب میں مبتلا نہ کر دے۔'' کہیں تمہاری آنکھوں پر فریب کا پردہ ڈال کر تمہیں حقائق سے غافل نہ کرنے پائے۔ اس اعتبار سے اقبال نے ابلیس کی اہمیت کو سمجھا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کی فریب کاری کا پردہ چاک کیا۔ اقبال اپنے بارے میں خود یہ بات فرماتے ہیں کہ مظاہر کے پردے کو چیر کر وجود کی حقیقت تک ان کی رسائی تھی۔ ع ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود''۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی زندگی

میں ایسے غیر معمولی لمحات آتے تھے۔ انہیں اللہ نے یہ خاص وصف عطا کیا تھا۔ بلاشبہ وہ حقیقت بیں نگاہ کے مالک تھے۔

می شود پردۂ چشمم پرِ کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے!

یعنی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ میری آنکھ کا پردہ اتنا باریک ہو جاتا ہے اور نظر میں اتنی تیزی آ جاتی ہے کہ میں دونوں جہان ایک نگاہ میں دیکھ لیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے جیسے اشتراکیت کا پردہ چاک کیا یہ انہی کا حصہ تھا۔ فرماتے ہیں۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اسی طریقے سے ابلیس کے ہتھکنڈوں کو بھی انہوں نے بڑی خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے کہ آج صوفی و ملا بھی درحقیقت ابلیسی نظام ہی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں کہ ابلیس کس طریقے سے ہماری صفوں کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔ ابلیس کا ایک مشیر کہتا ہے۔

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ابلیسیت کے مظاہر میں سب سے بڑا مظہر انسان کو اللہ کے مقابلے میں ایک باغی کی حیثیت سے لا کھڑا کرنا ہے۔ ملوکیت سے مراد کسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ سیاسی حوالے سے کُل اختیار اور بالادستی میرے پاس ہے' جبکہ اقبال کہہ رہے ہیں کہ

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بُتانِ آزری

اس حوالے سے ملوکیت بھی اپنی اصل کی اعتبار سے بہت بڑا شرک ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی' اگر وہ اسلام کی حدود سے آزاد ہو تو بہت بڑا شرک ہے' اس لئے کہ اس میں سروری اللہ کے لئے نہیں ہے بلکہ جمہور کے لئے ہے۔ صوفی و ملا کو یہ معلوم ہی نہیں

کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے' اقوام عالم کس بڑے شرک میں مبتلا ہیں' شرک آج غیر محسوس طریقے پر مادہ پرستی اور وطن پرستی کی صورتوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ جبکہ اقبال کی نگاہ تیز نے اس بات کو دیکھا اور پہچانا۔ بلاشبہ اللہ نے انہیں ''براہیمی نظر'' عطا فرمائی تھی ۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

اس دور میں ابلیسیت کے مظاہر میں سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ ابلیس نے پورے کرۂ ارض پر فرعونیت کو ایک نظام کی صورت میں غالب کر دیا ہے۔ پہلے ابلیس عام طور پر افراد کو شکار کرتا تھا' لیکن اب چونکہ اجتماعیت کا دور ہے' لہٰذا اجتماعی اعتبار سے ابلیس نے یہ غلبہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی صورت میں حاصل کر لیا ہے جس کا نعرہ آج امریکہ نے لگایا ہے جو ''سول سپریم پاور آف ارتھ'' ہے۔ اصل کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ نیو ورلڈ آرڈر' جیو ورلڈ آرڈر ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب سے بڑا ابلیسی نعرہ ہے' اللہ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر دراصل فرعونیت اور قارونیت کا مجموعہ ہے' یہ بدترین استحصالی نظام ہے۔ ایسے نظام میں ایک عام انسان کا اللہ کی توحید اور اللہ کی بندگی پر قائم رہ جانا انتہائی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ اسی کا نام دجالیت ہے۔ احادیث کی رُو سے دجالی فتنے کے دور میں کسی شخص کا ایمان پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہوگا جیسے اپنی ہتھیلی پر انگارے رکھ کر اسے برداشت کرنا۔

دوسرا کام جو ابلیس نے اس دور میں کیا ہے اور جس سے اس کی بالادستی ثابت ہوئی ہے' وہ انسان کو شرف انسانیت سے محروم کرنا ہے۔ اس کے لئے اس نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک سود' دوسرے مادر پدر آزادی۔

سود کی حقیقت کو بھی اقبال نے خوب سمجھا۔ فرماتے ہیں ۔

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

یعنی سود خوری کے نتیجے میں انسان کا باطن تاریک اور اس کا دل اینٹ اور پتھر کی طرح

ہو جاتا ہے اور سود خور شخص ایک ایسے درندے کی مانند ہے جس کے دانت اور پنجے نہ ہوں۔ سود کے ذریعے سے معیشت میں تقسیم دولت کا نظام ایسی غلط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے کہ جس کے نتیجے میں ایک طرف دولت کا ارتکاز جبکہ دوسری طرف محرومی جنم لیتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر آج ہمارا اپنا معاشرہ ہے کہ جس کا ایک بڑا حصہ نہایت تیزی کے ساتھ غربت کی لکیر (Poverty line) سے نیچے جا رہا ہے۔ پاکستان میں رفتہ رفتہ مڈل کلاس ختم ہو رہی ہے۔ ایک طرف محرومی بڑھ رہی ہے' دوسری طرف ارتکاز دولت بڑھ رہا ہے۔ فقر کی ایک انتہا انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے جبکہ ارتکاز دولت کی صورت میں انسان کی حیوانیت اس پر غالب آ جاتی ہے اور وہ اشرف المخلوقات کی صفات سے عاری ہو کر درندے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ابلیس نے انسان کو اس کے مقام سے گرانے کے لئے جو دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے' وہ آزادی کے نام پر فحاشی اور عریانی کا فروغ ہے۔ وہ اپنے اصل کام یعنی انسان کے جسم سے لباس اتروانے اور اسے شرم و حیا کے پاکیزہ جذبات سے محروم کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان اخلاقیات اور معاشرتی اقدار میں بالکل حیوان کی سطح پر آ چکا ہے۔ چنانچہ اس طرح ابلیس نے آدمی کو انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مقام سے گرا کر اپنی فوقیت کو ثابت کیا ہے۔

ایک اور حقیقت جسے اقبال نے نوٹ کیا تھا' وہ یہ کہ اس وقت ابلیس کے سب سے بڑے ایجنٹ اور آلہ کار یہود ہیں' جنہوں نے نہایت شاطرانہ انداز میں بینکنگ کے نظام کے ذریعے پورے یورپ کو اپنے معاشی چنگل میں جکڑ لیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایں بنوک ' ایں فکرِ چالاکِ یہود
نُورِ حق از سینۂ آدم ربود!

چنانچہ پچھلی صدی کے اوائل ہی میں انہوں نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا کہ ع

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!

اور وہ چیز اب بالکل عیاں ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ اُس وقت تو وہ مشاہدے پر مبنی ایک خیال تھا' لیکن وہ خیال اب واقعتاً کھل کر ایک حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ یہود اور

ابلیس میں جو چیز قدرِ مشترک ہے' اس کو اگر پہچان لیا جائے تو دورِ ابلیسیت کی اصلیت سمجھ میں آ جائے گی۔

ابلیس کا اصل مسئلہ کیا تھا؟ جب اسے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے کہا کہ ﴿اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ؕ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ ﴿۱۲﴾﴾ ''میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا جبکہ اسے مٹی سے پیدا کیا۔'' لہٰذا میں بلند تر ہوں اور اس کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ اس تکبر کی بنا پر وہ اپنے مقام سے گرا اور مردود اور ملعون قرار پایا۔ اس کے سینے میں آدمؑ کے خلاف حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ تبھی اس نے کہا کہ میں انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ جہنم میں خود تو جاؤں گا ہی' اس کو انسانوں سے بھی بھروں گا۔ یہ اس کا چیلنج تھا کہ انہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا کہ جن کی وجہ سے میں اس مقام سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ ع قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟ ''جبریل و ابلیس'' کے عنوان کے تحت ایک مکالمے کے انداز میں اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ ابلیس کے نزدیک جنت سے اسے نکالے جانے کا ذمہ دار آدم ہے' لہٰذا اس کے خلاف ایک حسد اور جوشِ انتقام ابلیس کے دل میں موجود ہے۔ بعینہٖ یہ مسئلہ یہود کا بھی ہے۔ آنحضور ﷺ کی بعثت کے بعد وہ بھی اسی قسم کی آزمائش سے دوچار ہوئے جس سے شیطان یا عزازیل حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم ملنے پر ہوا تھا۔ یہود نے آنحضور ﷺ کو اچھی طرح پہچاننے اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہی وہ آخری نبی ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں ان کی الہامی کتابوں میں موجود ہیں' آنحضور ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا مسئلہ بھی عصبیت' تکبر اور نسلی برتری کا تھا۔ بنی اسرائیل کا کہنا تھا کہ جب گزشتہ دو ہزار سال کے دوران تمام انبیاء اور رسول ہمارے قبیلے اور ہماری نسل میں مبعوث ہوئے' تمام آسمانی کتابوں کا نزول ہمارے ہاں ہوا تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آخری نبی کو مان کر بنو اسماعیل کی برتری کو تسلیم کر لیں۔ چنانچہ ان کا تکبر سدِّ راہ بنا۔ پھر جب وہ ملعون قرار دیئے گئے' مغضوب علیھم قرار پائے اور بنو اسماعیل اس

عظیم منصب پر فائز کر دیئے گئے جو اس سے قبل یہود کو حاصل تھا تو حسد کی آگ ان کے سینوں میں بھڑک اٹھی۔ مسلمانوں کے خلاف یہ آگ آج بھی دہک رہی ہے۔ چنانچہ جو آخری معرکہ ہے' وہ اقبال کے نزدیک بھی اصل میں اسلام اور ابلیسیت کے مابین ہو گا۔ اس وقت پورے روئے ارضی پر ابلیس کے سب سے بڑے ایجنٹ یہود ہیں۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آج امریکہ پوری طرح یہود کی گرفت اور ان کے شکنجے میں ہے۔ اس طرح پوری دنیا میں سودی نظام کو بھی یہود ہی نے رائج کیا۔ مغرب میں فحاشی اور عریانی کے فروغ میں بھی یہود کا ہاتھ ہے۔ شیطان کے اصل ایجنٹ اس وقت یہی ہیں اور قیامت سے قبل حق و باطل کا جو آخری معرکہ ہونا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس میں مسلمانوں کے مقابلے میں یہود اور ان کے وہ حلیف شریک ہوں گے جن کی رگ جان ان کے پنجے میں ہے۔ وہ تمام قوتیں ایک طرف ہوں گی جبکہ دوسری طرف صرف مسلمان ہوں گے۔ اس آخری معرکہ کا وقت یقیناً بہت قریب ہے۔ اقبال نے اسے معرکۂ روح و بدن قرار دیا ہے۔

اس آخری معرکے کے حوالے سے اقبال نے اُمت کو بہت امید افزا پیغام دیا ہے' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ترجمان القرآن ہی نہیں بلکہ ترجمان حدیث بھی تھے۔ صحیح احادیث میں یہ واضح پیشین گوئی ہے کہ قیامت سے قبل آخری فتح اسلام کی ہو گی اور یہ دین پورے کرۂ ارض پر اسی شان سے قائم و غالب ہو گا جیسے آنحضور ﷺ کے دور میں جزیرہ نمائے عرب پر قائم تھا۔ چنانچہ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' واقعتاً اس اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہے کہ اس کے ذریعے موجودہ دور کے اصل مسائل اور فتنہ انگیزیاں بھی نمایاں ہوتی ہیں اور اسلام کا اصل پیغام بھی سامنے آتا ہے۔ آج کے صوفی و ملا کی غالب اکثریت اسلام کی روح اور اصل حقیقت سے بہت دُور ہے۔ اصل اسلام' جس سے ابلیس کو خطرہ ہے' وہ اقبال نے اسی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اِس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

یعنی ابلیس کے نزدیک اصل فتنہ وہ اشتراکیت نہیں جس کا اُس دور میں بڑا چرچا تھا، بلکہ اسے حقیقی اندیشہ اسلام سے ہے۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

شرعِ پیغمبر کی جو تفصیل اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں بیان کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا صحیح اور وسیع تر فکر علامہ اقبال پر کس درجے منکشف تھا۔ چنانچہ اس پہلو سے ان کا آخری پیغام یہ ہے کہ فیصلہ کن غلبہ بالآخر ابلیس کو نہیں بلکہ حق کی قوتوں ہی کو ہوگا۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

یعنی ہم اللہ کی جس بندگی کو بھلا چکے ہیں، وہ پھر یاد آئے گی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

ان شاء اللہ!

❁❁❁

فکرِ اسلامی کا عظیم سرمایہ

ایک مطالعاتی جائزہ

تحریر: محمد موسیٰ بھٹو

انیسویں صدی میں مغرب میں انسان اور کائنات کے مادی نقطۂ نگاہ کی تشریح اور ریاست اور ریاست کے جملہ علوم کو خالص سیکولر بنیادوں پر متشکل کر دینے کے فیصلہ سے نہ صرف یہ کہ مغرب میں مذہب اور خدا پرستی کی جگہ عقلیت' آزادی اور مادیت پرستی کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا' بلکہ اس کے اثرات اسلامی دنیا میں بھی تیزی سے پہنچنا شروع ہو گئے۔ چونکہ جدید علوم کو دین و مذہب سے آزاد اور خدا کے تصور سے بغاوت پر متشکل کیا گیا تھا' مغرب کے طاقتور استحصالی ملکوں کی طرف سے اسلامی ملکوں کو مفتوح کر کے ان کے نظامِ تعلیم کو تبدیل کر کے اپنے نظامِ تعلیم کے اجراء سے خود مسلمان ممالک کی ذہین آبادی میں دین و مذہب کی جدائی اور سیکولرزم کے تصورات فروغ پانے لگے اور وہ مسلمان معاشرہ جو انفرادی زندگی میں مذہب کی معمولی خلاف ورزی اور عمل کی عام کوتاہی کو بری نظروں سے دیکھتا تھا' اب اس معاشرہ میں شہروں اور محلوں کی سطح پر خوشحال آبادی میں ایسے افراد نمودار ہونے لگے جو اخلاقی اور عملی خرابیوں کے ساتھ ساتھ اعتقادی بگاڑ کا بھی شکار ہونے لگے اور جدید نظریات اور جدید علوم کے زیر اثر وہ اسلام کے بنیادی عقائد پر متشکک ہونے لگے اور انسان کے ارتقائی نظریۂ جدلیاتی مادیت کے تصور' کائنات کے بے خدا ہونے کے عقیدہ ''انسان سراپا جنسیت سے عبارت ہے یا وہ جبلتی جذبات کا کامل نمونہ ہے'' کے تصورات کے حامل افراد ابھرنے لگے۔ سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم پر اُبھارنے کے لئے جو تعلیمی

ادارہ تشکیل دیا' اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں قرآن ہوگا' بائیں ہاتھ میں سائنس ہوگی اور ہماری پیشانی پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہوگا' لیکن سرسید کا قائم کردہ ادارہ ہی ملک میں سیکولر لیڈر شپ کی تیاری کا مرکز بن گیا۔

یہ ایسی صورت حال تھی جس نے مسلمان مفکرین کو اسلام کی ایسی نظریاتی اور علمی تشریح کرنے پر اُکسایا جس میں جدیدیت کی پیدا کردہ علمی گمراہی' اعتقادی بگاڑ اور جدید نظریات کے مقابلہ میں اسلام کی برتری ثابت ہو۔ انسان و کائنات کی تخلیق میں قدرت کی گہری منصوبہ بندی اور ''اسلام دین فطرت ہے' جس سے افراد کا اعراض خود انسانی معاشرہ کے لئے زوال کا موجب ہے'' اس فکری پس منظر میں اسلام کی جدید تشریح کے لئے بیسویں صدی میں جن مفکرین نے اعلیٰ پیمانہ پر کام کیا' ان میں علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا مودودی' ڈاکٹر محمد رفیع الدین' خلیفہ عبدالحکیم' سید قطب اور مظہر الدین صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مفکرین نے اپنی اعلیٰ ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں اسلام کی نئی عقلی' علمی اور سائنٹیفک تشریح میں صرف کیں۔ بعض مفکرین اس سلسلہ میں جدیدیت سے مرعوب اور متاثر ہوئے اور شریعت پر زور دینے کی بجائے وہ دین کے بنیادی اصولوں ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے اور اجتہاد کے ذریعہ اسلامی شریعت کے بنیادی قوانین میں تبدیلی کا نسخہ پیش کرتے رہے۔ بعض مفکروں نے اسلام کی بطور نظام زندگی والی تشریح پر اپنی بیشتر توانائیاں صرف کیں' جس کی وجہ سے اسلام کی خدا سے محبت کی نصب العینی تعلیم متاثر ہوئی اور افراد کی سیرت سازی اور کردار سازی کا عمل متاثر ہوا۔

ان مفکروں میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب پر اللہ کا یہ بڑا فیضان ہے کہ انہوں نے اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں ایسا انداز اختیار کیا ہے جہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر جدیدیت سے مرعوبیت موجود نہیں اور اس فکر میں جہاں دورِ جدید کے بنیادی نظریات کا قرآن کی روشنی میں اعلیٰ دلائل' بہتر اسلوب اور سائنٹیفک انداز سے رد موجود ہے وہاں اسلامی فکر کی نصب العینی تشریح اور اس کے فرائض و واجبات کے

تدریجی نظام اور نصب العینی کے بنیادی مقتضاؤں کی تفصیل میں ڈاکٹر صاحب نے جس حکمت' بصیرت' توازن اور مؤمنانہ فراست سے کام لیا ہے وہ بے مثال ہے اور وہ ڈاکٹر صاحب کو دورِ جدید کے دیگر اسلامی مفکروں سے ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

خودشعوری کے عمیق مشاہدہ سے نتائج اخذ کرنا

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے قرآن وسنت کے وسیع مطالعہ' علمائے سلف سے گہرے ذہنی تعلق اور عارف فلسفی کی حیثیت سے نفس انسانی اور وجدان کی گہرائیوں اور خود شعوری (انسانی شخصیت) کی خصوصیات کے عمیق مشاہدہ سے جو نتائج اخذ کئے ہیں' اس کے مطابق انسان کی خودشعوری (شخصیت)' کائنات کی خودشعوری (اللہ کی ذات) سے تعلق کے ایسے رشتہ میں منسلک ہے کہ وہ اس تعلق کے منقطع ہونے کی محتمل ہی نہیں ہو سکتی۔ کائناتی خودشعوری سے بے نیازی' بے رخی اور انقطاع وہ چاہے چند لمحوں کا ہی کیوں نہ ہو' انسانی شخصیت کے لئے ناقابل برداشت اذیت کا موجب ہے اور اس سے فردِ انسانی غیر معمولی اعصابی اور ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ انقطاع زیادہ دیر تک جاری رہے تو اس سے افراد طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں تک کو خطرہ میں ڈال لیتے ہیں۔ یہ خودشعوری (نفس انسانی) اور خودی (وجدان) کی خصوصیات کا وہ گہرا مطالعہ ومشاہدہ ہے جس سے ڈاکٹر صاحب عارف فلسفی کی حیثیت سے خود دوچار ہوئے ہیں۔ خودشعوری اور خودی کے اس مشاہدہ میں ڈاکٹر صاحب یک وتنہا نہیں ہیں' بلکہ اُمت کے ان لاکھوں عارفوں' علمائے ربانی اور صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کا بھی یہی تجربہ ومشاہدہ ہے جو چودہ سو سال سے ملت کی تاریخ کے درخشاں ستاروں کی حیثیت سے موجود رہے ہیں۔ قرآن وسنت کے مطالعہ' علمائے ربانی سے تعلق اور خودشعوری کے اس مشاہدہ کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کی اسلام کی نصب العینی تشریح کا مرکزی نکتہ اللہ سے محبت کا نکتہ ہے' جس کے گرد ڈاکٹر صاحب کی ساری فکر گھومتی ہے۔

پاکیزہ نصب العین کی اہمیت اور اس کی تعیین کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کردار

نصب العین کے موضوع پر اگر گفتگو کی جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ موجودہ دور میں انسانیت اور بالخصوص مسلم اُمت کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوا ہے کہ وہ صحیح اور فطری نصب العین کے تعین اور اس نصب العین کو اپنی زندگی کے سارے انفرادی واجتماعی اداروں کی روح میں شامل کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ انسانیت اور مسلم اُمت اس وقت جس ہولناک بحران سے دوچار ہے کہ اس کی کوئی کل درست نہیں' انسان انسان کے لئے اور قومیں قوموں کے لئے عذاب بن گئی ہیں' سائنسی ترقی اور سارے مادی وسائل انسان کو غلامی کی نئی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں' اس کا بنیادی سبب انسان کے فطری نصب العین کے تعین میں ناکامی ہے۔ انسان کی فطرت میں حسن وکمال کے حامل نصب العین کی محبت کا جذبہ اس قوت کے ساتھ رکھا گیا ہے کہ اس کے بغیر نہ تو انسانی زندگی کی تشکیل وتعمیر کا کام ممکن ہے اور نہ ہی انسان کے داخلی جذبات اور اس کی نفسیات کی طمانیت وتشفی ممکن ہے۔ فطرت سے ہم آہنگ نصب العین کے تعین کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا فکر ہمارے لئے رہنمائی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ آپ کے فکر کا مرکزی نکتہ اللہ سے محبت کا نصب العین ہے' جو اطاعت رسول کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ اللہ کی محبت کا نصب العین جب افراد اور ریاست کے جملہ اداروں کا حصہ بن جاتا ہے تو ایسی ملت وجود میں آتی ہے جو اپنی آرزوؤں اور سارے مقاصد اور ساری توانائیوں کو قدرت کے مقاصد کے ارتقاء کے لئے استعمال کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ وہ ملت دنیا میں قدرت کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک طرف تو وہ ملت ناقابل تسخیر بن جاتی ہے' دوسری طرف وہ غلط نصب العین کی حامل قوتوں کے لئے نجات ورہنمائی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ مسلم اُمت کے داخلی اختلافات اور انسانیت کے باہمی اختلافات کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ صحیح

نصب العین کی محبت یعنی اللہ سے محبت کا نصب العین افرادِ انسانی سے کھویا گیا ہے۔ جب اطاعت رسول اور مخلصانہ عبادت کے ذریعہ اس نصب العین کی تشفی کا انتظام ہوگا تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر انسانی معاشرہ حسن و کمال کی حامل ہستی یعنی اللہ کے اوصاف و اخلاق سے مزین ہوگا' مفادات اور نفسانیت کی سیاست اور سرگرمیاں از خود مخلصانہ محبت اور رواداری میں تبدیل ہوں گی۔

مسلم اُمت جو اللہ کی طرف سے دوسری قوموں کی رہنمائی کے لئے متعین ہوئی ہے' اس وقت اس کی حالت یہ ہے کہ وہ فکری اور نظریاتی طور پر شدید انتشار سے دوچار ہے۔ اسے یہی معلوم نہیں کہ اس کا صحیح نصب العین کیا ہے۔ توحید و رسالت کے عقیدے کے باوجود عملی طور پر مسلمانوں کی زندگی نہ تو یورپی قوموں کی طرح غلط نصب العین سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی صحیح نصب العین ان کی ریاست اور انفرادی و اجتماعی اداروں میں بنیادی ہدف کے طور پر شامل ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اپنے فکر کے ذریعہ ہمارے لئے صحیح نصب العینی خطوط متعین کر کے مسلم ملت کو ایک طرف تو جملہ روحانی و اخلاقی خرابیوں اور ہمہ جہتی بحران سے نکال کر اس کی سیاست' معیشت' معاشرت اور ساری اجتماعی زندگی کے لئے لائحہ عمل متعین کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اپنے فکر کے ذریعہ پاکیزہ نصب العین کی حامل ملت کو توانائی فراہم کر کے مسائل کی شکار انسانیت کے لئے اسے ماڈل کی حیثیت بھی دینا چاہتے ہیں۔

انسانی زندگی کی یہ عجب خاصیت ہے کہ اس کی ساری سرگرمیاں نصب العین کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر نصب العین متعین نہیں' یا پاکیزہ نصب العین موجود نہیں تو سرگرمیوں کا صحیح رخ متعین نہیں ہوسکتا اور زندگی شدید کشمکش اور انتشار سے دوچار ہو جاتی ہے۔ غلط نصب العین کی صورت میں انسانی نفسیات اور خودی کی صحیح سمت میں نشوونما مکمل نہ ہوگی۔ اس لئے صحیح نصب العین کا تعین' ایسا نصب العین جو انسانی فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو' یہ انسانیت کے لئے موت و زیست کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اپنی بلند فکری پرواز سے کام لیتے ہوئے ہمارے لئے

جو رہنمائی فرمائی ہے وہ عظیم رہنمائی ہے۔

فطرتِ انسانی کے میلانات سے ناآشنا دانشوروں کو فلسفہ ونظریہ پیش کرنے کا استحقاق حاصل نہیں

ڈاکٹر محمد رفیع الدین بڑی جرأت رندانہ کے ساتھ یہ نکتہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انسانی فطرت حسن وکمال کی اصل ہستی کے ساتھ محبت کے جس نصب العین سے منسلک ہے اس ہستی کے اوصافِ حسن اپنائے بغیر اور اس کے مشاہدہ کے بغیر جو فکر وفلسفہ پیش ہوگا چونکہ وہ فطرت کے جذبات ومیلانات اور اس کے مقتضیات سے ناآشنائی پر مبنی ہو گا' اس لئے ایسے فلسفہ میں باطل کی آمیزش شامل ہوگی۔ فطرت کے حقیقی مقتضاؤں سے ناآشنا دانشوروں اور فلاسفروں کو سرے سے یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کے لئے فکر وفلسفہ پیش کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو چونکہ وہ فلسفہ فطرتِ انسانی کے میلانات ورجحانات سے عدم مطابق ہوگا' اس لئے اس طرح کا فلسفہ دنیا میں فتنہ وفساد پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس سے خیر کی توقع رکھنا ممکن نہیں۔

فروغِ اسلام کے کام کے وقت فریب نفس سے بچاؤ کی واحد صورت

یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں علم وفضل' تشریح اسلام اور دعوتِ اسلامی کے مقام پر فائز افراد کے لئے بھی یہ ناگزیر ہے کہ وہ جبلت کی حیوانی سرحدوں کو عبور کر کے اس نورِ ایمان تک پہنچیں جس کا تعلق وجدان کی گہرائیوں سے ہے۔ قرآن کے ظاہری الفاظ کے پیچ وخم میں الجھنے کی بجائے جب تک قابل ذکر حد تک تقویٰ اور یقین کے مقام تک رسائی نہیں ہوتی تب تک اسلام کا حقیقی فہم اور اس کی بصیرت کا حصول نہ صرف مشکل ہے' بلکہ ممکن نہیں' اسلامی دعوت کے جو افراد ظاہری علم کو تشریح اسلام اور دعوتِ اسلام کے کام کے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں' ایسے افراد فروغِ اسلام کے کام کے وقت نفس کے مکر وفریب میں پھنس کر معاشرہ میں تعمیر کی بجائے تخریب پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ قرآن کا یہ باطنی علم جسے نورِ ایمان'

تقویٰ اور یقین کی حالت کہا جا سکتا ہے' یہ کیسے حاصل ہوگا' اس کے لئے مخلصانہ طور پر اطاعت رسول' خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت اور کثرتِ ذکر اور پاکیزہ صحبت کا ماحول ضروری ہے۔ اس سے فہم قرآن کی رسائی کے سلسلہ میں حائل پردے اٹھ جاتے ہیں' نفس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور خدا اور بندہ کے درمیان دوئی کی دیوار گر جاتی ہے۔ نیز اندر کا مفتی بیدار ہونے لگتا ہے' جو زندگی کے ہر مرحلہ میں خدا کے لئے یا نفس کے لئے ہونے والے کاموں کی مسلسل نشاندہی کرتا رہتا ہے' بلکہ زوردار فتویٰ دینے لگتا ہے۔ حدیث میں اسی مفتی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہر معاملہ میں اندر کے مفتی سے پوچھا کرو' قرآن میں اسی نورِ ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت کے عطا ہونے کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

خودشعوری کا جلال و جمال کی صفات سے بہرہ ور ہو کر خدائی مقاصد کے فروغ اور باطل کے سدباب کے لئے کام کرنا

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے فکر کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ جب نصب العین کی محبت کو فطرت انسانی کا ناگزیر تقاضا قرار دیتے ہیں اور صحیح نصب العین اللہ کی محبت کو قرار دیتے ہیں تو اللہ کی محبت کا ایسا تصور' جس کے تحت بندہ ذکر وفکر اور مراقبوں کے ذریعہ اللہ کی ذات سے وصال میں فنا ہو کر عملی زندگی اور اس کے مقتضاؤں سے منقطع ہو جائے' وصال میں فنائیت کے اس تصور کو وہ اللہ سے محبت کے حقیقی نصب العین کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اللہ سے وصال کی حقیقی لذت اور اس کے مشاہدہ کی حقیقی صورت تو آخرت میں ہی حاصل ہوگی' یہاں وصال اور مشاہدہ کی دھندلی تصویر اور عکس حاصل ہوتا ہے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ فرد کی خود شعوری (شخصیت) اللہ کے نور سے منور ہو کر حیوانی اور جبلی مقتضاؤں سے قابل ذکر حد تک بلند ہو جائے اور خدائی اوصاف سے متصف ہو جائے۔ خودشعوری (شخصیت) جب ذکر وفکر' دھیان اور مراقبوں کے ذریعہ اصل خودشعوری (اللہ کی ذات) سے قربت حاصل کرتی ہے تو وہ جلال و جمال کی صفات سے بہرہ ور ہو کر ان صفات کی

قوت کے ذریعہ دنیا میں خدائی مقاصد کے فروغ اور باطل کے سدباب کے لئے مصروفِ کار ہو جاتی ہے۔ خدا کے مقاصد کے لئے اپنی روحانی قوتوں کو صرف کرنا' یہ خودشعوری کے مقاصد میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ خودشعوری کثرتِ ذکر وفکر کے بغیر حسن وکمال کی ہستی کے جلال و جمال کی صفات سے متصف نہیں ہوسکتی' اس لئے وہ دنیا میں مؤمن کی حیثیت سے اپنے بھرپور کردار کی ادائیگی اور باطل کے خلاف صف آرائی کی توانائی سے محروم رہتی ہے' اسے یہ توانائی کثرتِ ذکر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کی بحث بڑی ایمان افروز اور وجد آور ہے۔

جدید نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کے سلسلہ میں ڈاکٹر موصوف کا کردار

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے فکر کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے جدید نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر ان نظریات کے صحیح اجزاء کو باطل اجزاء سے جدا کر کے باطل اجزاء پر بھرپور علمی و استدلالی تنقید کر کے اسلام کے تصورِ لاشعور' تصورِ جبلت' تصورِ معاش' تصورِ سیاست اور تصورِ قومیت کو نہایت عمدہ طریقہ سے واضح کیا ہے۔ جدید نظریات پر ان کی یہ تنقید اور کائنات اور زندگی کے بارے میں ان نظریات کے برعکس اسلام کے تصورات پر ڈاکٹر صاحب کی یہ بحث اتنی قیمتی' جاندار' اطمینان بخش اور سیر حاصل ہے کہ جدید دور کے تعلیم یافتہ افراد سے لے کر چوٹی کے دانشور حضرات تک سب ان سے بہتر طور پر استفادہ کر سکتے ہیں اور جدیدیت کے حوالے سے یہ بحث ان کے سارے شکوک وشبہات اور اسلام پر بے اعتمادی کی فضا کو ختم کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں عالم اسلام میں اب تک ہونے والے سارے کام پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا کام بھاری ہے۔ جدید نظریات پر ان کے یہ سارے تنقیدی مباحث قرآن پر گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ قرآن چونکہ قیامت تک دنیا کے سارے مسائل میں رہنمائی کے لئے ہمارے لئے کافی ہے (حدیث قرآن ہی کی تشریح ہے) اور چونکہ قیامت تک باطل کی طرف سے پیش ہونے والے نظریات کی تردید کے لئے دلائل قرآن میں موجود ہیں' اس لئے ان دلائل کو قرآن میں تفکر کے ذریعہ اخذ کر کے باطل نظریات کے

خلاف استعمال کرنا یہ عارف فلسفی کا کام ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے یہ کام بہتر طور پر سرانجام دیا ہے۔ اگرچہ ان کے علمی دلائل کے کچھ پہلو وقتی نوعیت کے ہیں تاہم ان کی افادیت اب بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے فکر کی تیسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکر میں تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور قوموں کے عروج و زوال میں تعلیم کی فیصلہ کن اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر موصوف نے کوشش کی ہے کہ مغربی فلسفۂ تعلیم (جس میں ہمارے ملک کے نظامِ تعلیم کی بنیاد شامل ہے) کی علمی بنیادوں کو متزلزل کر کے اسلام کے فلسفۂ تعلیم کی بنیادوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے' تاکہ مغربی فلاسفروں اور ماہرین تعلیم سے مرعوبیت کا خاتمہ ہو اور اسلامی فلسفۂ تعلیم کے نقوش اور خدوخال واضح ہوں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے ''تعلیم کے ابتدائی بنیادی اصول'' کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل کتاب کے علاوہ ''اسلام کا نظریۂ تعلیم'' کے عنوان سے بھی ایک کتاب تخلیق کی ہے۔ تعلیم کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول مسلم دنیا میں مغربی فلسفۂ تعلیم پر تنقید اور اسلام کے فلسفۂ تعلیم کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کام پہلا کام ہے جو عالم اسلام میں ہوا ہے۔

موجودہ دَور میں مسلم دنیا جس طرح کفر کے عالمی تصورات سے متاثر ہو کر اپنے عقائد و نظریات کے یقین میں کمزوری پیدا کرتی جا رہی ہے اور اپنے امتیازی ملی تشخص سے دستبردار ہو رہی ہے' اس کے اسباب و علل اور اس سنگین صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جو بحث کی ہے وہ ایسی بحث ہے جو موجودہ دَور کے تقریباً سارے مفکروں کی بحث سے زیادہ مؤثر' جامع اور ہمہ جہتی ہے۔

فکر و فلسفہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی خدمات کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوموں اور ملتوں میں ایسی شخصیات صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے فلسفیانہ فکر میں ملی زندگی کی تعمیر کے لئے نہ صرف پاکستان کی ملت

اسلامیہ بلکہ سارے عالم اسلام کو فکر کے اتنے اہم، قیمتی اور ہمہ جہتی نکات دیئے ہیں کہ موجودہ دَور میں ہم اگر ان نکات کی بنیاد پر اپنی ملی، ریاستی اور اجتماعی زندگی کی اپنے نظریہ کی بنیاد پر تشکیل کا کام کرتے تو ہم بجا طور پر عالمی سطح پر ساری قوموں اور ساری انسانیت کے لئے مثالی کردار کے حامل بن سکتے تھے۔ اس طرح ملت اسلامیہ بلکہ خود انسانیت آج جس بحرانِ عظیم سے دوچار ہے اس بحران سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔

جدید دَور میں اسلام اور ملت اسلامیہ کو درپیش چیلنج کی نوعیت، جدید علوم کے بہاؤ وسیلاب کے مقابلہ میں قرآن اور فطرتِ انسانی کی روشنی میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید، نئے دَور کے نئے حالات میں اجتہاد کے لئے بنیادی خطوط کی نشاندہی، فلسفۂ تعلیم کے لئے بنیادی اصولوں کا تعین، جدید مغربی فلسفۂ تعلیم کی کوتاہیوں و خامیوں کی بھرپور نشاندہی، ملی زندگی کے لئے اسلامی نظامِ تعلیم کے لئے صحیح خد و خال کا تعین، نصب العینوں کی موجودہ دنیا میں اسلام کے لئے ہونے والی بہت ساری تشریحات کے اس دَور میں اسلام کی صحیح اور حقیقی نصب العینی تشریح، نظریاتِ جدید میں موجود باطل پہلوؤں کی سیر حاصل علمی تنقید، قرآنی و اسلامی فکر کی عالمگیر فکری تناظر میں پیشکش، ملت کی سیاسی، معاشی، تعلیمی، سماجی اور انتظامی و اجتماعی زندگی کی صحیح خطوط پر تشکیل جیسے بہت سارے بنیادی امور ہیں جن پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی فکر حکمت، توازن، بصیرت اور تدبر کی شاہکار ہے، جسے پڑھ کر وجدان اور عقل بے ساختہ کہنے لگتی ہے کہ موجودہ دَور میں ملت اسلامیہ کو اجتماعی حیثیت سے جس فکر کی ضرورت ہے وہ یہی فکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس فکر میں جہاں جدید استدلال اور علمی معیار کے سارے بنیادی تقاضے شامل ہیں وہاں قرآن و سنت کے سلف صالحین کے سارے بنیادی اجزاء بھی پوری طرح موجود ہیں۔

ملی زندگی کے دو مؤثر طبقات کے فکر و نظر میں افراط و تفریط کے اثرات اور اس کی نشاندہی

آج ہماری ملی زندگی کے دو طبقات کے فکر و نظر میں افراط و تفریط کی وجہ سے

اسلامی فکر کے صحیح خطوط اور نفاذِ اسلام کی صحیح ترتیب کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ پہلا طبقہ ان اہل علم و اہل دانش کا ہے جو جدیدیت سے بری طرح متاثر ہو کر یا تو سیکولرزم کا حامل ہو چکا ہے یا وہ جدیدیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مرعوبیت کی بنا پر اسلامی تعلیمات و احکامِ اسلامی میں پیوند لگانے یا اس کی مرعوبانہ تشریح میں اپنی توانائیاں صرف کر رہا ہے۔ اس طبقہ میں اخبارات و رسائل کے کالم نگار' کتابوں کے مصنف' کالجوں و یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے دانشور وغیرہ سب شامل ہیں۔ اجتہاد کے ذریعہ اسلامی قوانین کی از سرِ نو تشکیل اس طبقہ کا نعرہ ہے۔ چونکہ یہ طبقہ غیر اسلامی تعلیمی و تربیتی مراحل سے گزرا ہے اور جدید فکر کے زیر اثر ہی اس کی دینی اور مزاجی نشو ونما ہوئی ہے اس لئے یہ اسلام کی پابندیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس طبقہ میں بعض ایسے دانشور بھی شامل ہیں جو فرائض کی حد تک اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں لیکن مستشرقین کی تحقیقی کتابوں کے زیر اثر علمائے ربانی کی تشریحِ اسلام اور اجتہادِ اسلامی پر ان کا اعتماد مجروح ہو چکا ہے۔

دوسرا طبقہ مذہبی لیڈر شپ کا ہے' جو دینی معاملات میں لوگوں کی رہنمائی اور نفاذِ اسلام کی تحریک کا علمبردار ہے۔ ہمارا یہ طبقہ اسلام سے اپنے اخلاص کے باوجود نئے دور کے نظریاتی چیلنج اور عمرانی مسائل سے عدم واقفیت اور نفاذِ اسلام کی تدریجی حکمت عملی سے ناآشنائی کی وجہ سے اسلام کی اس طرح نمائندگی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے جس میں تدبر' پختگی' حقیقی شانِ اجتہاد اور سنجیدگی سے زیادہ جذباتیت اور سادگی موجود ہے۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے علمی کام سے عدم دلچسپی' معاشرہ کی سطح پر اسلامی فکر کو ہضم کرانے اور افرادِ معاشرہ کے نقطۂ نگاہ کو اسلامی بنائے بغیر سیاسی سطح پر نفاذِ اسلام کے کام کو دین کا کلی کام سمجھنے کی وجہ سے ہماری یہ دینی لیڈر شپ جدید چیلنج سے عہدہ برآ ہونے جیسے عظیم کام کی گہرائی و گیرائی سے پوری طرح بہرہ ور نہیں۔

ان دونوں طبقات کے فکر و نظر کی کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کے لئے توازنِ فکری کے ساتھ راہِ عمل اور حکمت عملی کے خطوط کے تعین کے سلسلہ میں بھی ڈاکٹر محمد رفیع

الدین صاحب کے پیش کردہ نکات بڑے حکیمانہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں ''پاکستان کا مستقبل'' کے نام سے کتاب لکھ کر پاکستان کی تعمیر و تشکیل نو کے لئے تفصیل سے ایک نظریاتی خاکہ تیار کیا' جس میں آپ نے بتایا کہ قدرت نے ہمیں عالمِ اسلام اور ساری دنیا کی رہنمائی کرنے کا عظیم موقع فراہم کیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اگر ہم نے اپنے نظامِ تعلیم' نظامِ سیاست اور نظامِ اخلاق کی بنیاد اسلامی تعلیمات اور اس کے اصولوں پر استوار نہ کی تو ہم گرا دیئے جائیں گے اور ہم ایسے انتشار اور خلفشار سے دوچار ہو جائیں گے کہ ہماری اجتماعیت بکھر جائے گی اور غلامی و زوال سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

جدید نظامِ تعلیم کا بے خدا فلسفہ
اور اجتماعی زندگی پر اس کے تباہ کن نتائج

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۵ء میں ''اسلام کا نظریۂ تعلیم'' کے نام سے کتاب لکھ کر اس میں جدید مغربی نظامِ تعلیم (جو ہمارے ملک میں بھی مروج ہے) کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ طالب علم کو کسی عقیدہ کی تعلیم نہیں دینی چاہئے' تاکہ اس کی عقل آزاد رہے اور اس میں خود ہر بات پر غور و فکر کر کے اسے ردّ یا قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو' اگر استاد کی طرف سے کوئی عقیدہ ٹھونسا گیا تو پھر اس کی سوچ بچار تنگ دائرہ کے اندر مقید ہو جائے گی۔ لیکن اس اصول پر عمل کرنے کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ طالب علم کی عقل تو آزاد ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس کے خیالات کا کوئی مرکز نہیں بنتا اس لئے وہ فکری انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ طالب علم کے اندر اس عقیدہ کو پیدا کیا جائے اور پختہ کیا جائے جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔

چونکہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد بے خدا فلسفہ پر ہے' اس لئے اس زمانہ میں انسانی

فطرت اور انسانی افعال و اعمال کے بارے میں جتنے بھی نظریات وجود میں آئے ہیں وہ سب کے سب بے خدا ہیں۔ مثلاً بے خدا فلسفۂ سیاست' بے خدا فلسفۂ اخلاق' بے خدا اقتصادیات' بے خدا قانون' بے خدا فلسفۂ تاریخ' بے خدا نفسیاتِ فرد اور بے خدا نفسیاتِ جماعت' یہ سارے نظریات اسی نظامِ تعلیم کا شاخسانہ ہیں۔ اگر ہم نے قدرت کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنے نظامِ تعلیم کو بلا تاخیر عقیدۂ توحید اور تعلیماتِ اسلامی کی بنیاد پر استوار نہ کیا تو دنیا کی قوموں میں ہمارے لئے عزت و وقار کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی' محتاجی اور ذلت ہم پر مسلط کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے فکر کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ انسانی فطرت اور شخصیت کی تخلیق کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ انسان اشیاءِ کائنات اور مظاہر کائنات کے پس پردہ کارفرما بنیادی قوانین اور ان میں جاری جزوی قانون اور اس کے اسباب وعلل کو جاننا چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ مضطرب ہے۔ چونکہ انسان کے ذہنی قویٰ میں یہ استعداد موجود ہے کہ وہ تلاش و تحقیق کی بتدریج ارتقائی کاوش سے اشیاءِ کائنات میں پوشیدہ قدرت کے ان قوانین کی اصلیت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے' اس لئے نبوت کے ذریعہ کائنات کے نظام میں پوشیدہ ان قوانین سے انسان کو آشنا نہیں کیا گیا۔ جس چیز کی صلاحیت و استعداد انسان کے ذہنی قویٰ میں موجود ہو' نبوت و وحی کے ذریعہ ان قوانین سے واقفیت چونکہ انسانی قویٰ کی استعداد کے اضمحلال کا موجب تھا' اس لئے یہ کام انسان کی ذہنی کاوشوں کے لئے چھوڑا گیا۔ خود قرآن میں اس کام کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیا گیا۔ قرآن حکیم نے آسمانوں اور زمینوں میں مظاہر قدرت کو دیکھنے کے بعد ان پر غور و فکر کے بغیر آگے گزر جانے سے منع کیا ہے کہ ایسا کرنے سے خدا کی معرفت کے مواقع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ طبیعیاتی علوم' حیاتیاتی علوم' نفسیاتی علوم اور اس کی ساری شاخیں سائنسی علوم کہلاتے ہیں۔ یہ سارے علوم علمی صداقت کی حیثیت رکھتے ہیں اور آیات اللہ کے ایک سلسلہ کے طور پر وجود میں آتے ہیں' اس لئے یہ سائنسی علوم دراصل قرآنی تشریح و تعبیر کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ جدید سائنس کے بے خدا ہونے کا

سبب یہ ہے کہ جدید سائنس دانوں کی طرف سے مظاہر قدرت کا مشاہدہ و مطالعہ منکر خدا کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کا وجدان غلط معبود کی محبت سے سرشار ہوتا ہے' اس لئے انہیں مظاہر قدرت' آیات اللہ یعنی خدا کی ہستی' اس کی صفاتِ خالقیت اور ربوبیت پر دلالت کرنے والے نشانات کی حیثیت سے نظر نہیں آتے۔

جدید سائنسی علوم کا کائنات کی اصل اور بنیادی حقیقت اور قرآنی حقائق کے خلاف استعمال ہونے کا بنیادی سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ سائنس دان یا سائنس کو فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرنے والے فلاسفر پہلے سے باطل نصب العین کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں' اس لئے مظاہر قدرت حقیقت تک رسائی میں ان کے ممد ومعاون ثابت نہیں ہوتے۔ سائنس نے حیاتیات' طبیعیات اور نفسیات میں جن علوم کا انکشاف کیا ہے ان علوم میں صداقت کے بہت سے اجزاء ایسے موجود ہیں جو کائنات میں پوشیدہ قوانین قدرت سے آشنائی اور خدا کی صفاتِ خالقیت و ربوبیت کے جلوہ کے مشاہدہ کا ذریعہ ہیں۔ سائنس کی علمی صداقتیں دراصل قرآنی حقائق کی تفصیلات و جزئیات ہیں' جو سائنس کے باطل فلسفہ کا حصّہ ہو کر باطل فلسفہ کی زینت' رونق اور ترقی کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ باطل فلسفہ میں موجود اِن صداقتوں کو جو قرآنی حقائق کا حصّہ ہیں' جو قرآن سے جدا کی گئی ہیں' ان کو پھر سے قرآن سے جوڑ دیا جائے۔ سائنس کی علمی صداقتیں نورِ قرآن کی بکھری ہوئی کرنیں ہیں جو ظلمت کفر میں کھوئی ہوئی ہیں۔ ان کرنوں کے ذریعہ سے جہاں تعلیم نبوت کو دنیا کے کناروں تک پہنچایا جا سکے گا وہاں اس آلۂ حرب وضرب کو دشمن کے خلاف استعمال بھی کیا جا سکے گا اور ردِ باطل کے لئے یہ صداقتیں غیر معمولی طور پر مؤثر ثابت ہوں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان علمی صداقتوں کا تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کے ذریعہ قرآن کے مطالب کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تشریحِ قرآن اور تعبیرِ اسلام کے بارے میں اُمت میں موجود سارے اختلافات مضمحل ہو جائیں گے اور مسلم ملت کی ساری عملی زندگی قرآن کی بنیادوں پر استوار ہو سکے گی۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے سائنس میں موجود علمی صداقتوں کی قرآن کی تشریح کی حیثیت سے جس نکتہ پر توجہ دلائی ہے وہ نہایت اہم نکتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''اسلام اور سائنس'' کے نام سے اپنی کتاب اور قرآن اور علم جدید میں اس موضوع کے بیشتر پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ہمارے علماء وفضلاء اگر اپنی ذہنی کاوشوں کے لئے قرآن کی اس تشریح کو موضوع بحث بنائیں تو ہمیں جدید دَور کے چیلنج سے زیادہ بہتر طور پر عہدہ برآ ہونے اور اسلام کو دنیا کی ساری قوموں کے لئے قابل قبول دین کی حیثیت دلانے میں مدد ملے گی۔ قرآن میں اس آنے والے دَور کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾

''ہم عنقریب انہیں انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے (یعنی ایسے علمی حقائق ان پر منکشف کریں گے) جن سے ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے''۔

الغرض کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے دانا' بینا اور عارف فلسفی کی حیثیت سے اسلامی فکر کی نصب العینی تشریح وتعیین' اسلامی تحقیق کے صحیح طریق کار کی نشاندہی' اسلامیات کے مغربی محققوں کے طریق کار کی کمزوریوں کی نقاب کشائی' نفاذِ اسلامی کی صحیح تربیت سے لے کر نظامِ تعلیم کی نظریاتی بنیادوں پر تشکیل سے انحراف کے نتائج کے انتباہ تک مسائل اور فکر ونظر کے بہت سارے گوشوں کے بارے میں فکر انگیز رہنمائی کی ہے۔

ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے اقتباسات پیش کریں' تاکہ ملی اور قومی زندگی کے اہم معاملات میں غور وفکر کی بہتر صورت پیدا ہو سکے اور اگر قوم کے اہل دانش اور قومی لیڈر شپ میں استفادہ کی صلاحیت موجود ہو تو وہ اس سے استفادہ کر سکے۔ اگرچہ ان اقتباسات سے یہ مضمون کافی طویل ہو جائے گا' تاہم اس کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ ملت کے بنیادی نظریاتی مسائل کے بارے میں عالم اسلام کے ممتاز فلسفی کی تحریروں کا عطر سامنے آ سکے۔

آدرش کی محبت کے جذبہ کی نوعیت

آئیڈیل یا آدرش کی محبت کا جذبہ انسان کے سارے اعمال کا سرچشمہ ہے' یہ جذبہ ایسا ہے کہ اگر انسان اس کے اظہار کا صحیح طریق نہ جانتا ہو تو اس کا اظہار غلط طریق سے کرتا ہے' یعنی ایک غلط تصور کو اپنا آدرش بنا لیتا ہے' پھر خدا کی تمام صفات اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کی عبادت اور اطاعت اس طرح کرتا ہے گویا وہ سچ مچ خدا ہے یا خدا کی صفات کا مالک ہے' لیکن صحیح' کامل اور سچا نصب العین اس ہستی کا تصور ہے جو اِس کائنات کی خالق ہے' جو ربّ ہے' رحمٰن و رحیم ہے' حی و قیوم ہے' علیم و قدیر ہے اور فرضی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر تمام صفاتِ حسن و کمال کی مالک ہے۔ (قرآن اور علم جدید' ص ۲۵۱)

(جاری ہے)

بقیہ: سورۃ الحدید

میں ہے۔ عالم اسم فاعل ہے' علیم اسی سے صفت مشبہ ہے۔ اسم فاعل میں کوئی فعل وقتی طور پر ہوتا ہے اور اگر وہی فعل کسی کے اندر دائم ہو جائے تو پھر وہ صفت مشبہ بن جاتا ہے۔ عالم: کسی شے کا جاننے والا اور علیم: جس میں یہ صفت مستقل اور پائیدار ہو گئی ہے۔ اسی طرح حاکم وہ ہے جس کی حکومت قائم ہے' اور حکیم جس کی حکومت میں دوام ہے' استقلال ہے' ہمیشگی ہے' پائیداری ہے۔ تو اس اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مترادف ہو جائیں گے اور ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' کا مفہوم ہوگا کہ وہ زبردست ہے اور وہ حاکم حقیقی ہے۔ (جاری ہے)

[نوٹ: سورۃ الحدید کا یہ درس محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن آڈیٹوریم میں ہفتہ وار نشستوں میں دیا۔]

ابداع، خلق اور تدبیر

سید وصی مظہر ندوی☆

مغرب میں جہالت اور ظلمت کا دَور جب اندلس کے مسلمان مفکرین، اہل دانش، علوم طبیعی کے ماہرین اور کائنات کے بارے میں اسلام کے علمی نقطۂ نظر کی اشاعت سے ختم ہونے لگا تو بدقسمتی سے ابتداء ہی میں مغربی مفکرین، اصحابِ فکر و دانش، علومِ تجربی کے ماہرین اور محققین کا تصادم شہنشاہیت کے سایہ اور حمایت میں پروان چڑھنے والے ادارے کلیسا اور اس کے ان محافظوں سے ہوگیا جو صدیوں سے جہالت اور جمود میں غرق تھے۔ کلیسا کے ان نام نہاد پیشواؤں نے اندلس سے آنے والی علم و تحقیق کی اس لہر کو اپنے جاہلانہ عقائد کے خلاف بغاوت قرار دے کر ہر قسم کے ظلم و زیادتی کے ذریعہ اس کو دبانے کی کوشش کی۔ اصحابِ علم و دانش کے خلاف گمراہی اور کفر کے فتوے جاری کئے اور ان کے نتائج کو کلیسا دشمنی قرار دے کر ان کو سنگین سزائیں دینے کے لئے بدنام زمانہ مذہبی عدالتیں قائم کیں۔ ان عدالتوں نے قید و بند ہی نہیں قتل اور آگ میں زندہ جلانے تک کی سزائیں دیں۔

اس ظلم و ستم کے نتیجے میں بیداری کی یہ لہر تو تھم نہ سکی، لیکن علم و تحقیق اور آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار کی کلیسا اور اس کے محافظوں سے مستقل دشمنی قائم ہوگئی، حتیٰ کہ فکر و دانش اور سائنس کے علمبرداروں نے ہر شعبے میں مذہب و کلیسا کے نظریات و عقائد کو مسترد کر دینا علم اور روشن خیالی کی لازمی علامت تصور کر لیا۔ شاعرانہ زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ ؎

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

اس طرح فلسفہ و سائنس دونوں غیر جانبدارانہ علمی نقطۂ آغاز سے محروم ہو کر

☆ برامپٹن۔ اونٹاریو (کینیڈا)

مذہب دشمنی کی راہ پر چل پڑے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دوسرے سے بالکل ممتاز خصوصیات کی حامل انواعِ حیوانات کو متحد الاصل بتا کر انسان کو محض ایک ترقی یافتہ حیوان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ اپنی رہنمائی کے لئے کسی بالاتر ہستی کی طرف دیکھنے کے بجائے حیوانات کی زندگی ہی کو اپنے لئے نمونہ بنالے۔ اس طرح کائنات، جس کا ذرہ ذرہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق وہی ہوسکتا ہے جو علیم وحکیم اور قدیر وخبیر ہو، اس شہادت کو پسِ پشت ڈال کر کائنات کا معمہ حل کرنے کے لئے اندھے بہرے مادے میں ایک مفروضہ بڑے اتفاقی دھماکہ سے پیدا ہونے والی ہلچل کو میکانکی حرکت قرار دے کر کائنات کی تمام موجودات کی تخلیق وارتقاء کو اس میکانکی حرکت کا نتیجہ قرار دے دیا گیا۔

تخلیق کائنات اور اسلام

جاہلیت اور مذہب دشمنی پر مبنی کائنات کی تخلیق کے اس نظریہ کو اسلام یکسر رد کرتا ہے۔ چنانچہ علم وحکمت اور حیات وقدرت سے محروم اندھے بہرے مادے کو ازلی اور قدیم ماننے کے بجائے اسلام کائنات کی تمام موجودات کی شہادت، فطرتِ انسانی کی تصدیق اور علومِ غیب تک دسترس رکھنے والے انبیاء اور رسولوں کی تائید سے یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات کی ایجاد، موجودات کی تخلیق اور حکمت ومصلحت کلی کے مطابق تمام موجودات میں توافق وتعاون پیدا کر کے کائنات کا صحیح سمت میں ارتقاء، سب ایک ایسی ہستی کا فیضان ہے جو حیات وقدرت اور علم وحکمت کا سرچشمہ ہے۔ زمین کے ایک ایک ذرے سے لے کر سورج اور چاند جیسے بڑے بڑے اجرامِ فلکی تک سب اس کے حکم اور ارادہ واختیار کے تابع ہیں۔ کائنات کی تخلیق وارتقاء کے حوالے سے اس ہستی کے جن افعال کا ظہور ہمہ وقت ہو رہا ہے وہ تین افعال ہیں: ابداع، خلق اور تدبیر۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان تینوں افعال کو قرآن وسنت اور مشاہدے کی روشنی میں اچھی طرح واضح کیا ہے۔

ابداع:

ابداع کے لغوی معنی تو بالکل نئی یا انوکھی شے کو وجود میں لانا ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ نے اس اصطلاح کا تعارف اس طرح کیا ہے:

هُوَ اِیْجَادُ شَیْءٍ لَا مِنْ شَیْءٍ فَیَخْرُجُ الشَّیْءُ مِنْ کَتْمِ الْعَدَمِ بِغَیْرِ مَادَّةٍ

''کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے بغیر وجود میں لانا ابداع ہے' چنانچہ اس کے تحت پردۂ عدم سے کوئی چیز کسی مادے کے بغیر برآمد ہوتی ہے۔''

چونکہ محض مادے کو خود بخود موجود فرض کر لینے سے کائنات کا معمہ حل نہیں ہوتا' اس لئے بعض مذاہب اور بعض فلاسفہ نے خدا' مادّہ اور روح کو قدیم ماننے کا تکلف کیا ہے' حالانکہ کسی مسئلے کے حل کے لئے اگر کچھ نہ کچھ شے فرض کرنا ضروری ہو تو وہ مفروضہ شے بس اتنی ہونی چاہئے جس سے مسئلہ حل ہو جائے۔ چنانچہ ایک ایسی ہستی کو مان لینے کے بعد جو علم' حکمت' قدرت' حیات' سمع و بصر اور ارادے کی مالک ہے' کائنات کا معمہ حل ہو جاتا ہے اور مادے یا روح کو ازلی طور پر خود بخود موجود فرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس حقیقت کو قرآن مجید اور احادیث میں مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الانعام:۱۰۱)

''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد (مبدع) ہے۔''

یعنی اس سارے عالم کی تخلیق جس مادے سے ہوتی ہے اس کو پردۂ عدم سے اللہ تعالیٰ عالمِ وجود میں لایا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے:

کَانَ اللّٰهُ وَلَمْ یَکُنْ شَیْءٌ قَبْلَهٗ (بخاری:۷۴۱۸)

''اللہ (اُس وقت بھی موجود) تھا جب کوئی چیز اس سے پہلے نہ تھی۔''

خلق یا تخلیق:

خلق یا تخلیق کی اصطلاح کو شاہ صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے:

هُوَ اِیْجَادُ شَیْءٍ مِنْ شَیْءٍ

''کسی چیز کو کسی چیز سے وجود میں لانے کو خلق کہا جاتا ہے۔''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے بنایا' تمام جانداروں کا آغاز پانی سے کیا۔ تاہم ان تمام مخلوقات کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے محکم قوانین کے تابع بنا دی ہے۔ ان قوانین کو اجمالی طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

۱) اللہ تعالیٰ نے مختلف عناصر اور اشیاء میں کچھ خاصیتیں رکھ دی ہیں جو خاصیتیں ان اشیاء سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً سنکھیا (ایک زہر) کا خاصہ جاندار کو ہلاک کر دینا ہے۔ سونٹھ کا خاصہ گرمی اور خشکی پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح کافور کا خاصہ ٹھنڈک پیدا کرنا ہے۔

۲) عناصر کی ہر نوع میں بھی کچھ خصوصیات رکھی ہیں۔ مثلاً انسان کا خاصہ نطق ہے اور سیدھا کھڑا ہو کر ہاتھوں سے کام لینا ہے۔ گھوڑے کی نوع کا خاصہ جسم کا کج ہونا' کھال پر بال ہونا' ہنہنانا وغیرہ ہے۔

۳) اسی طرح ہر جنس کے کچھ خواص ہیں۔ مثلاً نباتات میں نشوونما کی صلاحیت' حیوانات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ خود اپنے ارادے سے جانے کی صلاحیت۔

جن محکم قوانین کے تحت یہ مختلف موجودات اپنے خواص کے مطابق کام کرتی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں (جیسے آگ پانی کو بھاپ میں تبدیل کر دیتی ہے) انہی محکم قوانین کو مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ رکھنے والوں نے یہ معنی دیئے کہ ان موجودات کے اوپر کوئی اور صاحبِ ارادہ و قدرت ہستی موجود نہیں ہے' بلکہ یہ موجودات مشینی خودکار نظام کے تحت خود بخود سرگرم عمل ہیں۔ لیکن یہ مفروضہ غلط ہے اور اس تعصب پر مبنی ہے جو مغربی دانشوروں میں مذہب کے خلاف اربابِ کلیسا کی نادانی سے پیدا ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے قرآنی تعلیمات اور انسانی مشاہدات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم کی تخلیق کے بعد اس سے لاتعلق نہیں ہو گیا بلکہ اپنے عدل و رحمت کے تقاضوں کے مطابق اس نے کائنات کی تدبیر و انتظام کو بھی خود سنبھال رکھا ہے۔

تدبیر:

تدبیر کی تعریف شاہ صاحب نے اس طرح کی ہے:

''عالم موالید (عناصر) کی تدبیر یہ ہے کہ عناصر سے وہی نتائج ظاہر ہوں جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوں' چنانچہ اس کی سخاوت و رحمت جس مصلحت کا تقاضا کرے عناصر کا عمل اسی مصلحت کو بروئے کار لائے۔''

پھر تدبیر کی یہ تعریف بیان کرنے کے بعد اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے:

''عناصر کے اندر جو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں اور جو قوتیں ان عناصر سے کبھی جدا نہیں ہوتیں' جب یہ قوتیں ایک دوسرے کی مزاحمت کرتی ہیں اور ان کے اندر باہم تصادم ہوتا ہے تو اللہ کی حکمت کے تحت ان سے مختلف نتائج ظہور میں آتے ہیں۔ ان نتائج میں بعض جوہر (یعنی اپنی ذات سے قائم) ہوتے ہیں' مثلاً مٹی اور پانی ملنے سے کیچڑ یا گارا بن جاتا ہے اور بعض نتائج عرض (یعنی کسی دوسرے جسم کے ساتھ قائم ہونے والی شے) ہوتے ہیں' جیسے حرارت جو پانی اور آگ کے باہم ملنے سے پانی میں پیدا ہو جاتی ہے''۔

پھر یہ اعراض جو جانداروں میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱) اَفعال..... مثلاً کسی جاندار میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے جو ایک فعل ہے۔

۲) ارادے

یہ تمام اثرات اور حالات جو عناصر کی باہمی ملاوٹ یا تصادم سے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے کوئی اثر یا حال بجائے خود شر نہیں ہے' کیونکہ ان کا ظہور اس خاصہ کے تحت ہوتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے ان عناصر میں رکھا ہے۔ مثلاً تلوار میں اگر کاٹنے کی صلاحیت ہے تو یہ صلاحیت بذاتِ خود شر نہیں ہے۔ یا آگ جلاتی ہے تو یہ جلانا بجائے خود شر نہیں ہے' کیونکہ یہ اس خاصہ کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء میں رکھا ہے' مگر کسی اور پہلو سے اس خاصہ کا ظہور شر بن جاتا ہے' مثلاً کوئی ظالم بے گناہ کو تلوار سے قتل کر دے یا آگ سے کسی غریب کی جھونپڑی جل جائے۔ ظاہر ہے کہ مظلوم کا قتل

ہونا یا جھونپڑی کا جل جانا شر ہے۔ چنانچہ جب ان عناصر سے کوئی اثر یا نتیجہ ظاہر ہونے والا ہوتا ہے جو کسی دوسرے پہلو سے شر ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کے ذریعہ اس میں مداخلت فرماتا ہے اور شر کے ظہور کو روک دیتا ہے۔ اس روکنے کے چار طریقے ہیں:

۱) **قبض**: یعنی کسی عنصر یا سبب کے اثر کو سکیڑ کر کم کر دینا' مثلاً قاتل کی ضرب کا زور کم کر دینا تا کہ وہ کاری اور مہلک نہ رہے' یا جیسے جنگ بدر میں ہتھیاروں سے لیس ایک ہزار بہادروں پر مشتمل فوج ۳۱۳ ناکافی ہتھیاروں والے اور بیشتر ناتجربہ کار افراد پر مشتمل دستے کے مقابلے میں شکست کھا گئی۔

۲) **بسط**: کسی عنصر یا سبب کے اثر کو ناقابل تصور حد تک بڑھا دینا' مثلاً گھونسے میں اتنی طاقت پیدا کر دینا کہ وہ مہلک بن جائے یا مٹھی بھر خاک کا مخالف فوج کے ہر سپاہی کی آنکھوں میں گھس جانا یا محض زمین پر پاؤں مارنے سے چشمہ پھوٹ نکلنا۔

۳) **احالہ**: یعنی کس خاصیت یا اثر کو بالکل الٹ دینا' جیسے آتشِ نمرود کو سرد اور سلامتی بخش بنا دیا گیا۔

واضح رہے کہ تدبیر کے یہ طریقے بالعموم غیر ذی روح عناصر کے سلسلہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ عالم اسباب میں اس طرح کی مداخلت انتہائی مخصوص حالات میں شاذ و نادر ہی کی جاتی ہے' کیونکہ اگر یہ مداخلت عام طور پر کی جانے لگے تو عالم اسباب پر سے مخلوق کا اعتماد ختم ہونے کے نتیجہ میں نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب عالمِ اسباب اور عناصر کے اثرات کی وجہ سے کسی شخص یا اشخاص کو بیجا یا ناحق نقصان اٹھانا پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ اس نقصان کی تلافی فرما دیتا ہے' مثلاً اگر کسی کی آنکھیں پیدائشی طور پر یا کسی بیماری کی وجہ سے بصارت سے محروم ہو جائیں تو اس کے دیگر حواس بالخصوص لمس (چھونے) کی قوت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر حالات کی مجبوری کے تحت کسی نقصان کی تلافی اس دنیا میں نہیں ہو پاتی تو مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کی تلافی مؤثر طور پر کر دی جاتی ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف وہاں کی نعمتوں میں بالکل فراموش ہو جاتی ہے۔

۴) **الہام** (دل میں ڈالنا): تدبیر کا یہ چوتھا طریقہ جانداروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ الہام یا دل میں ڈالنے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں' مثلاً سوچ یا خیال پر اثر انداز ہونا۔ اس طرح کا الہام قریب قریب سب انسانوں کو ہوتا رہتا ہے' بلکہ دیگر حیوانات کو بھی یہ الہام ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی اچانک کسی جگہ جانے کا ارادہ کر لیتا ہے' یا اسی طرح ایک ارادے کو منسوخ یا ملتوی کر دیتا ہے۔ ایک ہوائی جہاز یا ٹرین پر سفر کا ارادہ بدل کر دوسری پرواز یا ٹرین سے سفر کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اس تبدیلی سے وہ کسی بڑے نقصان سے بچ جاتا ہے یا کوئی بڑا فائدہ حاصل کر لیتا ہے' یا اس کے برعکس اور اس تبدیلی سے وہ کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو جاتا ہے یا کسی فائدے سے محروم رہ جاتا ہے۔

اسی طرح فطری اور جبلی رہنمائی بھی الہام کی ایک شکل ہے۔ مثلاً بچے کا ماں کی چھاتی سے دودھ پینا' شہد کی مکھی کا اپنا چھتا بنانا' چھتے میں تقسیم کار پر عمل کرنا اور شہد بنانا' اس عمل کا ذکر خود قرآن حکیم میں ''وحی'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس وحی کی بہت عمدہ مثال ان پرندوں کی وہ طویل پروازیں ہیں جو موسم سرما اور گرما میں کئی کئی براعظموں کے درمیان یہ کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جرمنی کے ایک محقق Dr.Wemes Dun Gitt کی اس تحقیق کا ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی تدبیر ''الہام'' کو سمجھنے کے سلسلہ میں بے حد مفید ہے جو اس نے ایک پرندے پلور (Plover) کے بارے میں کی ہے' اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یہ پرندے الاسکا سے موسم سرما میں جنوب کی طرف جزائر ہوائی کی طرف نقل مکانی کرتے ہیں۔ اڑھائی ہزار میل کا یہ سفر ان کو ایک اڑان میں مکمل کرنا ہوتا ہے کیونکہ راستے میں کوئی اور جزیرہ یا ساحل موجود نہیں ہے' جبکہ یہ پرندہ سمندر میں تیرنا بھی نہیں جانتا کہ پانی میں دم لے سکے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس سفر کے دوران وہ اڑھائی لاکھ مرتبہ اپنے پروں کو پھیلاتا اور سکیڑتا ہے۔ اس طرح یہ پرواز وہ ۸۸ گھنٹوں میں مکمل کرتا ہے۔ پرندہ جب اس سفر کا آغاز کرتا ہے تو توانائی کے خزانے کے طور پر اس کے جسم میں کوئی ۷۰ گرام چربی ہوتی ہے'

لیکن سائنسی فارمولے کے مطابق وہ اپنے سفر میں جس رفتار سے توانائی صرف کرتا ہے اس کے مطابق اس کی محفوظ شدہ توانائی سے سفر کا صرف ۸۱ فیصد فاصلہ طے ہوسکتا ہے۔ یعنی اس کی منزل ابھی ۵۰۰ میل کے فاصلے پر ہوتی ہے جب فارمولے کے مطابق اس کی توانائی کو ختم ہو جانا چاہئے' چنانچہ باقی ماندہ فاصلہ طے کرنے کے لئے توانائی کی موجودگی کا اہتمام خالق کائنات نے بہت پراسرار انداز میں کیا ہے۔ ان پرندوں کو جبلی طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ تنہا اس سفر پر نہ جائیں اور دورانِ سفر ان کی ہر ٹکڑی V کی شکل میں پرواز کرے۔ اس طرح پرواز کرنے سے وہ اپنی ۲۳ فیصد قوت بچا لے جاتے ہیں۔ چنانچہ منزل پر پہنچ کر ان پرندوں کے پاس عام طور پر ۶.۸ فی صد قوت ابھی مزید باقی ہوتی ہے۔ یہ محفوظ قوت اتفاقی حوادث کے لئے ہے کہ اگر دورانِ سفر مخالف ہوا کے طوفان کا سامنا کرنا پڑ جائے تو یہ توانائی کام آ سکے۔''

(بالاختصار از رسالہ ترجمان القرآن' ماہ جون ۲۰۰۲ء' ص ۵۲' ۵۳)

کیا پرواز کے ان طریقوں کا علم اور ایندھن و فاصلہ کے مابین یہ نسبت پرندوں نے اپنے تجربے سے حاصل کی ہے یا پرواز کی تربیت دینے والے کسی ادارے کی ڈگری ان کے پاس ہے؟

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ ۛ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۛ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ﴾ (الملک:۱۹)

''کیا لوگ اپنے اوپر پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ صرف رحمٰن (اللہ) ہی انہیں تھامے ہوئے ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (ہر پہلو اس کے مدنظر ہے)۔''

اس طرح کا الہام جبلی طور پر ہونے کے علاوہ دل کے ارادے اور سوچ میں تبدیلی پیدا کر کے کبھی خواب کے ذریعہ اور کبھی کسی اچانک قرینے کو دکھا کر تمام ذی روح مخلوق کو کیا جاتا رہتا ہے۔

نیز یہ الہام کبھی اس شخص کو ہوتا ہے جس کا اپنا معاملہ ہوتا ہے' جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قیدی ساتھیوں کے خواب اور کبھی دوسرے شخص کو ہوتا ہے' جیسے سات

سالہ قحط رونما ہونے کے بارے میں بادشاہِ مصر کا خواب۔

یہ الہام کبھی وحیٔ شرعی کی صورت میں ہوتا ہے جو اللہ کا فرشتہ اس کے کسی منتخب بندے تک اس طرح پہنچاتا ہے کہ جس بندے کو پہنچایا جاتا ہے اُس کو اُس کے وحیٔ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔

الہام اور وحی کی ان تمام صورتوں کا اجمالی ذکر سورۂ شوریٰ کی اس آیت کریمہ میں موجود ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (الشوریٰ: ۵۱)

''کسی انسان کو یہ استحقاق نہیں کہ اللہ اس سے (براہِ راست) کلام کرے، مگر وحی (تیز اشارے) کی صورت میں یا کسی پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام دینے والا (فرشتہ) بھیجے تو اس کے اذن سے جو وہ چاہتا ہے وحی کر دے۔ بیشک وہ برتر حکمت والا ہے۔''

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تخلیق کا یہ نظام خود کار مشینی نظام نہیں بلکہ:

﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (القصص: ٦٨)

''اور تیرا ربّ جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے اور (اس تخلیق میں) انتخاب کرتا ہے، تخلیق میں یہ انتخاب کا حق ان کو حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر نقص سے پاک ہے اور جن کو یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں ان سے وہ (بہت) برتر ہے۔''

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : مثالی اسلامی ریاست کے خدوخال

مصنف : فرقان دانش خان

ضخامت : 176 صفحات

قیمت : 80 روپے

ملنے کا پتہ : ☆ صفہ پبلشرز، عطی بلڈنگ، 19A۔ ایبٹ روڈ، لاہور

☆ قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

دین کامل ہونے کے ناطے اسلام کی تعلیمات ہمہ گیر اور جامع ہیں۔ انسانی زندگی کو درپیش ہر مسئلے کا حل اس میں موجود ہے۔ اس کا اپنا نظامِ اخلاقیات ہے جو عین فطری تقاضوں کے مطابق ہے۔ اسی طرح اس کا معاشرتی نظام، معاشی نظام اور سیاسی نظام اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کے سیاسی نظام کو اس طرح استوار کیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست میں ہر طرف امن وامان اور عدل وانصاف کا دور دورہ ہو، ہر انسان کی جان و مال محفوظ ہو، طبقاتی اونچ نیچ نہ ہو بلکہ تمام لوگوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

اس کتاب میں مصنف نے مثالی اسلامی ریاست کے خدوخال پر بحث کی ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام ''خلافت'' پر استوار ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس سال تک نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم رہا۔ اس دور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ یکے بعد دیگرے خلیفہ رہے۔ ان چاروں کو خلفائے راشدین کہتے ہیں۔ اس کتاب میں ان چاروں خلفاء کے ادوار کا الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد دورِ خلافت معاویہؓ اور یزید کی جانشینی کا ذکر کیا

گیا ہے جس میں خلافت' ملوکیت کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر ملوکیت کا دور دورہ ہوا جس میں ایک مختصر عرصے کے لئے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آیا جس نے پھر سے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔

ان ادوار کا تذکرہ کرنے کے بعد مصنف نے عہد حاضر میں نظامِ خلافت کے قیام کے لئے راہِ عمل کی طرف نشاندہی کی ہے جو کہ اکثر و بیشتر ممتاز عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد کے فکر کا نتیجہ ہے جس میں احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ نوید جانفزا سنائی گئی ہے کہ ایک دفعہ پھر دنیا میں نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو کر رہے گا۔ چنانچہ مصنف نے تلقین کی ہے کہ ہر مسلمان کو نظامِ خلافت کے قیام میں اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق جدوجہد کرنا چاہئے' تاکہ وہ اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو کر اللہ کے ہاں سرخرو ہو سکے۔

کتاب ٹھوس شواہد پر مبنی ہے جو مصنف کی بالغ نظری اور فکری استحکام کا پتہ دیتی ہے۔ خوشنما ٹائٹل اور دیدہ زیب کمپوزنگ کے ساتھ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

(۲)

نام کتاب : مسائل عیدین

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

ضخامت : 100 صفحات

قیمت : 40 روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ قدوسیہ' اردو بازار' لاہور

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ دونوں مسلمانوں کے خوشی کے دن ہیں۔ ان دونوں ایام کو گزارنے کا پروگرام بھی شریعت اسلامیہ میں طے شدہ ہے۔ کھانے پینے اور اچھے کپڑے پہننے سے خوشی اور مسرت کا اظہار تو فطری بات ہے' اس کے علاوہ عید کے دن دو رکعت نماز بھی ہے' جس کے لئے سب لوگ شہر سے باہر اکٹھے ہوتے ہیں اور مل کر ایک امام کی اقتداء میں نماز ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے برکت اور سلامتی کی دعا مانگتے ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے حدیث وسنت کے مطابق عید کا دن منانے کا تفصیلی پروگرام بتایا ہے کہ اس موقعے پر کون کون سے کام مسنون اور مستحب ہیں۔ کتاب کو 28 عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے' ہر عنوان پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور مستند معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ عید کی نماز کا طریقہ مسلک اہل حدیث کے مطابق پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیرات کے ساتھ بتایا گیا ہے جس کی تائید میں سنت رسول ﷺ اور عمل صحابہؓ سے دلائل دیئے گئے ہیں۔

عید کے دن کا مکمل پروگرام اور کرنے کے تمام کام اس کتاب میں بڑی جامعیت کے ساتھ بتا دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یوم عید کے بارے میں کسی استفسار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ سادگی کے ساتھ عیدین کے تمام مسائل یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یوں ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے تاکہ وہ عید کا دن مسنون اور مستند اعمال کے ساتھ گزار سکے۔

کتاب کے آخر میں عیدین کے مسائل کا خلاصہ لکھ دیا گیا ہے تاکہ تھوڑے وقت میں تمام ضروری معلومات فراہم ہو جائیں۔ کتاب بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے۔ جا بجا حوالہ جات دیئے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

خوبصورت ٹائٹل' دلکش کمپوزنگ اور صحت لفظی نے حسن باطنی کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری کو بھی دوبالا کر دیا ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

(۳)

نام مجلّہ : ماہنامہ محدث۔ اشاعتِ خاص فتنہ انکارِ حدیث

مدیر اعلیٰ : حافظ عبدالرحمٰن مدنی

ضخامت : 284 صفحات

قیمت : 100 روپیہ

ملنے کا پتہ : اسلامک ریسرچ کونسل' 99۔ جے' ماڈل ٹاؤن لاہور

''محدث'' صحیح عقائد اور اسلام کی ٹھوس تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کا ایک باوقار

مجلّہ ہے جس میں بلند پایہ علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ محدث کا زیرِ تبصرہ شمارہ فتنۂ انکارِ حدیث پر خصوصی اشاعت ہے۔ اس شمارے میں بلند پایہ علمائے حق کے وقیع مضامین کو حسنِ ترتیب سے آراستہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے فتنۂ انکارِ حدیث کے اسباب بیان کئے گئے ہیں جن میں سب سے بڑا سبب مغرب کی علمی مرعوبیت اور عقل پسندی کا رُجحان ہے۔ اس کے بعد اس فتنہ کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ پرویز کے کفریہ عقائد کو بیان کر کے حجیتِ حدیث کی مضبوط بنیادیں واضح کی گئی ہیں۔ تدوین حدیث کے ضمن میں کی جانے والی کوششوں اور حفاظت حدیث کے مختلف ذرائع کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس فتنہ کی نمایاں ترین شخصیت غلام احمد پرویز ہے، جس کے گمراہ کن افکار اور عجیب وغریب قرآنی تعبیرات کی بنا پر اُمت اسلامیہ کی صاحب علم وفضل شخصیات نے اسے خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ ان علماء میں پاکستان کے علاوہ عالم عرب کے ممتاز اہل علم بشمول امامِ کعبہ، مفتی اعظم سعودی عرب اور شیخ عبدالعزیز بن باز شامل ہیں۔

اس اشاعتِ خاص میں شامل مختلف اشاریہ جات جو اس موضوع پر شائع ہونے والی کتب اور مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، نہایت گراں قدر علمی سرمایہ ہیں۔ مختصراً یوں کہنا چاہئے کہ ''محدث'' کا یہ شمارہ فتنۂ انکارِ حدیث پر انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتا ہے۔

(۴)

نام کتاب : ماہنامہ الہادی کراچی (حضرت محمد احمدؒ نمبر)

مدیر مسئول : مولانا حافظ مشتاق احمد عباسی

ضخامت : 224 صفحات

قیمت : 120 روپے

ملنے کا پتہ : ادارہ اشاعت القرآن، اے 742، بلاک ایچ، نارتھ ناظم آباد کراچی نمبر 33

ماہنامہ الہادی کراچی کا یہ خصوصی نمبر حضرت الحاج محمد احمدؒ مولف تفسیر ''درس

قرآن'' کے تعارف پر مشتمل ہے۔ موصوف نے گیارہ جلدوں پر مشتمل تفسیر درس قرآن لکھی جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس تفسیر میں ہر درس دس پندرہ منٹ کے دورانئے کا ترتیب دیا گیا ہے۔ درس کی زبان بالکل سادہ ہے۔ اس تفسیر کے بارے میں ملک کے جید علمائے کرام نے اچھی رائے دی ہے۔

الحاج محمد احمدؒ بنیادی طور پر انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ اسی دوران مولانا اشرف علی تھانویؒ کی صحبت نصیب ہوئی اور دین کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔ جب آپ ۱۹۶۸ء میں ملازمت سے فارغ ہوئے تو ہمہ وقت اسی کام میں لگ گئے۔ اسی ذوق وشوق، رغبت اور محنت کے نتیجے میں گیارہ جلدوں پر مشتمل تفسیر درس قرآن منصۂ شہود پر آئی۔ اس تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ سلف صالحین کے انداز میں حدیث وسنت اور اقوال صحابہؓ سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا۔

ماہنامہ الہادی کے اس خصوصی نمبر میں جہاں مولانا الحاج محمد احمدؒ کے پاکیزہ حالات زندگی اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں وہاں ان کی تفسیر کا تعارف اور اس کے بارے میں جید اور مستند علمائے کرام کی آراء بھی درج کر دی گئی ہیں۔

الہادی کا یہ نمبر مضبوط جلد میں محفوظ کیا گیا ہے۔

"To promote science-Religion dialogue in the modern world, Hazara Society for Science-Religion Dialogue (www.hssrd.org) Mansehra announces with pleasure the free provision of the second issue of SCINCE-RELIGION DIALOGUE (English Urdu Issue.) The first issue of the journal was also distributed free of cost both inland & outside the country. Interested men of letters are advised to send postal stamps worth Rs. 35 for registered delivery. However donations to continue the journal will be highly appreciated."

Professor Abdul Majid,
Chairperson HSSRD,
Mari khankhail, Mansehra ,
Post code 21340
chairperson@hssrd.org www.hssrd.org

امام ابنِ جریج القرشیؒ

(۸۰ھ ــــ ۱۵۰ھ)

عبدالرشید عراقی

ابن جریج کا شمار تبع تابعین کے اس زمرہ میں ہوتا ہے جنہوں نے تفسیر و حدیث کی تدوین و ترتیب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ علم تفسیر میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا اور اپنے معاصرین میں اس فن میں ان کو امتیازی شان حاصل تھی۔

ان کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج تھا۔ ۸۰ھ میں مکّہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔[1] مکّہ میں شعر و ادب اور فقہ و حدیث کا عام چرچا تھا۔ ابن جریج نے اپنی تعلیم کا آغاز شعر و ادب سے کیا اور عمر کا ایک حصّہ شعر و ادب کی وادی میں گزار دیا۔ جب عمر ڈھلنے لگی اور کہولت کے آثار شروع ہوئے تو علومِ دینیہ کی تحصیل کی طرف توجہ کی اور اس کے بعد پوری زندگی علومِ دینیہ کی تحصیل میں بسر کر دی۔

اساتذہ

جب ابن جریج علومِ دینیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اس وقت مکّہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد امام عطاء بن ابی رباح کا چشمہ فیض جاری تھا۔ چنانچہ ابن جریج نے ان سے تفسیر، حدیث اور فقہ میں تحصیل کی۔ اس کے بعد آپ نے جن اساتذہ و شیوخ سے استفادہ کیا ان کے نام یہ ہیں: امام محمد بن شہاب زہری، امام نافع مولیٰ ابن عمرؓ، ہشام بن عروہ، امام جعفر صادق، یحییٰ بن سعید انصاری، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد وغیرہ۔[2]

علم و فضل

علم و فضل کے لحاظ سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، تمام علوم میں ان کو مکمل دسترس

حاصل تھی۔علمائے اسلام نے ان کے تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔

حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ اور احد الاعلام لکھا ہے۔ (۳)

امام احمد بن حنبل ان کو علم کا ظرف اور ان کے استاد عطاء بن ابی رباح اہل حجاز کا سردار کہتے تھے۔ (۴)

امام نووی فرماتے ہیں کہ:

''علمائے سلف وخلف نے ابن جریج کے علم وفضل اور مناقب کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔اگر ان کو شمار کیا جائے تو شمار نہیں ہو سکتے''۔ (۵)

علم تفسیر

علم تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سرفہرست تھے۔ ان کا لقب ترجمان القرآن تھا۔تابعین میں حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد حضرت عطاء بن ابی رباح ممتاز تھے۔ابن جریج حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کے شاگرد تھے اور ۱۷ سال تک ان کی صحبت میں رہے تھے۔ان سے حضرت ابن جریج کو وافر حصّہ ملا تھا لیکن بعض ائمہ اسلام نے ان کی تفسیر پر زیادہ اعتماد نہیں کیا۔

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ:

''ابن جریج نے تفسیر میں زیادہ صحت کا اہتمام نہیں کیا۔وہ ہر آیت کی تفسیر میں غلط صحیح ہر طرح کی روایات نقل کر دیتے ہیں''۔(۶)

علم حدیث

علم حدیث میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کا شمار جامعین حدیث میں ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں امام علی بن المدینی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''حدیث نبوی کی روایات کا دارومدار ۶ آدمیوں پر ہے، پھر ان ۶ آدمیوں کا علم ان کے درمیان سمٹ گیا جنہوں نے علم حدیث کی تدوین کی اور ان تدوین کرنے والوں میں ایک ابن جریج بھی ہیں''۔ (۷)

ابن جریج کا شمار جامعین حدیث میں ہوتا ہے۔ان کے دور میں مختلف شہروں میں

جن ائمہ اسلام نے حدیث کی تدوین کی ان کی تفصیل یہ ہے:

۱) ابن شہاب زہری (م۱۲۴ھ) نے مدینہ میں
۲) عبدالملک بن جریج (م۱۵۰ھ) نے مکّہ میں
۳) امام اوزاعی (م۱۵۷ھ) نے شام میں
۴) امام معمر بن راشد (م۱۵۳ھ) نے یمن میں
۵) امام سفیان ثوری (م۱۶۱ھ) نے کوفہ میں
۶) امام حماد بن سلمہ (م۱۶۷ھ) نے بصرہ میں
۷) امام عبداللہ بن مبارک (م۱۸۱ھ) نے خراسان میں

انہوں نے احادیث کے جمع وتدوین کے کام میں سبقت کا شرف حاصل کیا۔ (۸)

علمِ فقہ

علمِ فقہ میں بھی ان کو عبورِ کامل حاصل تھا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ:

''شافعی طرزِ فقہ کی داغ بیل جن ائمہ نے ڈالی اس میں ابنِ جریج کا شمار بھی ہے۔ امام شافعی نے فقہ میں امام مسلم بن خالد زنجی سے استفادہ کیا تھا اور امام مسلم بن خالد امام ابن جریج سے مستفیض تھے''۔ (۹)

تصنیف

علمائے اسلام نے ان کو صاحب تصنیف لکھا ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں:

اوّل من صنف الکتب ابن جریج وابن ابی عروبه (۱۰)

''سب سے پہلے جن لوگوں نے الگ الگ عنوانات پر کتابیں تصنیف کی ان میں ابن جریج اور ابن ابی عروبہ سب سے مقدم ہیں''۔

ابن ندیم نے ان کی ایک کتاب ''کتاب السنن'' اور صاحب کشف الظنون نے ان کی ایک کتاب تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ (۱۱)

اور صاحب شذرات الذہب علامہ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں:

اوّل من صنف الکتاب بالحجاز (۱۲)

''حجاز میں سب سے پہلے ابن جریج نے تدوین کا کام شروع کیا''۔

عادات واخلاق

آپ عادات واخلاق کے اعتبار سے بلند مرتبہ ومقام کے حامل تھے۔ بہت زیادہ عبادت گزار تھے۔ خشیت الٰہی کا ان پر بہت زیادہ غلبہ رہتا تھا۔ زہد وورع کا پیکر تھے' بہت زیادہ سخاوت کرنے والے تھے اور اس کے ساتھ طبیعت میں بہت زیادہ نفاست تھی۔ (۱۳)

وفات

ذی الحجہ ۱۵۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (۱۴)

حواشی

۱) شذرات الذہب' ج۱' ص۲۲۶
۲) تہذیب التہذیب' ج۶' ص۴۰۴
۳) تذکرۃ الحفاظ' ج۱' ص۱۶۰
۴) تہذیب الاسماء واللغات' ج۲' ص۲۹۷
۵) تہذیب الاسماء واللغات' ج۲' ص۲۹۷
۶) اتقان' ج۲' ص۱۸۵
۷) تہذیب التہذیب' ج۶' ص۴۰۴
۸) اسلام میں سنت کا مقام' از مولانا عبدالغفار حسن عمر پوری' ص۹
۹) تہذیب الاسماء واللغات' ج۲' ص۲۹۸
۱۰) تہذیب الاسماء واللغات' ج۲' ص۲۹۸
۱۱) تبع تابعین' ج۱' ص۲۳۸
۱۲) شذرات الذہب' ج۲' ص۲۲۲
۱۳) شذرات الذہب' ج۲' ص۲۲۲
۱۴) تذکرۃ الحفاظ' ج۱' ص۱۵۳

کلام اقبال

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!

پیش رفت

انجمن خدام القرآن جھنگ کی سرگرمیاں

ماہِ نومبر کے خطباتِ جمعہ کا عنوان ''استقبال رمضان'' رہا اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ زیرِ درس رہی۔ جھنگ میں قرآن حکیم کو سمجھنے کا ذوق بحمد اللہ بڑھ رہا ہے۔ پچھلے تین سال سے تاریخی جامع مسجد عبید اللہؒ محلّہ سلطانوالہ جھنگ صدر میں صدرِ انجمن انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب ''دورۂ ترجمۂ قرآن'' کی ذمہ داری کماحقہ نبھا رہے ہیں۔ امسال عاملہ کی ماہوار میٹنگ میں اس پروگرام کو مزید بہتر بنانے کے لئے مشورہ ہوا اور ایک نئے پروگرام کا اضافہ ہوا کہ چونکہ مسجد ہٰذا میں رکن انجمن حافظ عبدالماجد صاحب پہلے ہی سے تراویح پڑھا رہے ہیں اس لئے وہی رانا مختار احمد' محمد سلیم لودھی اور رانا اعجاز احمد کی نگرانی میں ہر چار تراویح کے بعد ترجمۂ قرآن بھی پیش کریں گے' بعد ازاں محترم فاروقی صاحب تفسیر پیش کریں گے۔ بحمد اللہ یہ پروگرام پہلے سے بہتر انداز میں منعقد ہوا۔ اس پروگرام کی مناسب پیمانے پر پہلے سے بڑھ کر تشہیر کی گئی۔ حاضرین کی کثیر تعداد کے باوجود شرکاء نے بوریت محسوس نہ کی اور عام طبقے کو بھی ایک مرتبہ ترجمۂ قرآن سننے کا موقع مل گیا۔ محترم فاروقی صاحب روزانہ تین سے چار گھنٹے درس دینے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ درمیان میں چائے کا وقفہ بھی ہوتا' جس میں سوال و جواب اور باہمی افہام وتفہیم کے ساتھ ساتھ تعارف کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہم کسی قرآنی خانقاہ میں آ چکے ہیں۔ اعتکاف کرنے والے حضرات کو بھی تعارف وتربیت کا موقع ملتا رہا۔

اس دوران اس صدائے قرآنی سے متاثر ہو کر بہت سے احباب نے انجمن میں شمولیت اختیار کی اور قرآن اکیڈمی کی تعمیر میں شرکاء نے دل کھول کر حصّہ ڈالا۔ اس ماہِ مبارک کی آخری طاق راتیں پوری کی پوری قرآن حکیم کے ساتھ گزاری گئیں۔ ۲۹ ویں

شب کو دورۂ ترجمۂ قرآن کے ساتھ قرآن حکیم کو مختلف انداز میں ختم کیا گیا' اور صدر متحدہ مجلس عمل جھنگ مولانا محمد انور چیمہ کی دعا اور پر مغز بیان پر یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

امسال تحریک رجوع الی القرآن کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ شہر کے کئی علماء نے اپنے ہاں دورۂ ترجمۂ قرآن کی طرز پر پروگرام منعقد کئے اور اس طرح مجموعی طور پر قرآن فہمی کی طرف ایک رجحان بڑھا۔ پہلی مرتبہ مولانا محمد اعظم طارق نے رہائی کے بعد اپنی مسجد میں بذاتِ خود اس کام کو سنبھالا' اگرچہ وہ اس کو مصروفیت کی بنا پر زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکے۔ مولانا محمد انور چیمہ' مولانا ذوالفقار علی' پروفیسر قاری محمد ناصر' مفتی ریاض احمد' مولانا عبدالقدوس' مولانا عبدالعلیم یزدانی وغیرہم نے ایسے پروگرام کئے اور ان سے صدر انجمن کا تعاون بھی جاری رہا۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقامات پر اراکین انجمن نے ذاتی سطح پر پروگرام کئے۔ افطاری کے ساتھ دروس ہوئے اور ماہِ مبارک میں تحفہ رمضان کے نام سے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' نامی کتابچے بھی مفت تقسیم کئے گئے۔ ذہین طلبہ میں ''الکتاب'' تقسیم کی گئی۔ انجمن اور اکیڈمی کا تعارف ہوا اور ساتھیوں نے تعاون بھی کیا۔ ہر متاثر ساتھی نے کسی نہ کسی طریقے سے اس تعاون میں حصہ لیا۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں مزید اخلاص نصیب فرمائے اور ہم سے یہ کام لے کر اپنی رضا اور اُخروی نجات سے نوازے۔ (آمین)

(مرتب: سیکریٹری انجمن خدام القرآن جھنگ)

فرمانِ نبوی ﷺ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

''تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔''

(صحیح بخاری۔ بروایت حضرت عثمانؓ)

بحمد اللہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کے دروس و تقاریر پر مشتمل تیسری CD بعنوان

اسلام اور خواتین

تیار کر لی گئی ہے جس میں اہم معاشرتی موضوعات کے بارے میں
قرآن و سنت کی راہنمائی پر 15 تقاریر شامل ہیں

(۱) خواتین اور سماجی رسومات
(۲) خواتین کی دینی ذمہ داریاں
(۳) شادی بیاہ کی رسومات
(۴) اسلام میں عورت کا مقام
(۵) مثالی مسلمان خاتون
(۶) جہاد میں خواتین کا کردار
(۷) اسلام میں شرائط حجاب کے احکام
(۸) قرآن اور پردہ

وغیرہ جیسے پندرہ موضوعات شامل ہیں۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی '36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور (فون : 03-5869501' فیکس : 587400